نقوشِ رفتہ
رفعت سروش

(مضامین)

رفعت سروش

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی
حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

ترتیب

صفحات

	صفحات
۱۔ حرفِ آغاز	۶
۲۔ میرا مزاج لڑکپن سے	۹
۳۔ نقوشِ دلّی	۲۹
۴۔ ذوالفقار علی بخاری	۴۷
۵۔ میرا دوست — مجاز	۵۷
۶۔ نہال سیوہاروی	۶۵
۷۔ راکیش، ایک شعلہ	۷۶
۸۔ حرفِ آرزو (یادِ احتشام حسین)	۸۲
۹۔ یادِ شکیل	۸۷
۱۰۔ خوابوں کا شہزادہ ساحر	۹۵
۱۱ یہ مشاعرے	۱۰۳
۱۲۔ لینن کے دیار میں	۱۱۷
۱۳۔ بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی	۱۵۳
۱۴۔ غالب اور اس کا عہد	۱۶۸
۱۵۔ شہیدِ وطن (اشفاق اللہ خاں)	۱۸۶

بار اوّل :- ستمبر ۱۹۸۳ء

تعداد :- چھ سو

قیمت :- چالیس روپے

ناشر :- رفعت سروش
اے ۷۔۴/۱۳۴۔ پنڈارا روڈ
نئی دہلی ۳

تقسیم کار :-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
یونیورسٹی مارکٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

(نعمانی پریس دہلی)

حرفِ آغاز

یادیں انسانی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور ان لمحات میں جب آدمی حال سے بیزار ہو جاتا ہے؟ یا بے ہنگم زندگی کی کشاکش سے اکتا جاتا ہے تو یادوں کے نہاں خانوں میں پناہ لیتا ہے۔ اور ایک گونہ سکون محسوس کرتا ہے۔ ان نہاں خانوں کی سیرِ زندگی کو نیا حوصلہ اور نیا ولولہ بخشتی ہے۔ گذشتہ واقعات کو یاد کر کے کبھی اپنے کئے پر پشیمانی ہوتی ہے۔ کبھی فخر اور کبھی اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے ـــــ ماضی عمرِ رواں کے غبار میں لپٹا ہوا ہے۔ مگر زندگی کے وہ لمحے جو یادوں کے نہاں خانوں

ہیں زندہ و تابندہ ہوتے ہیں۔ شاید زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اور ان کی بازیافت خود شناسی کے دریچے کھولتی ہے ــــ بچپن اور لڑکپن کی کچھ ایسی ہی یادیں ــــ ایسے ہی لمحے ــــ اس کتاب کے صفحات پر بکھرے ہوتے ہیں ــــ مشاعروں کے سلسلے میں آوارہ گردی اور لینن کے دیار کی سیر بھی انھیں یادوں کا ایک حصہ ہے۔

اس مجموعہ کے بیشتر مضامین ان دوستوں اور بزرگوں کی یادوں پر مشتمل ہیں جو آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر جن کی رفاقت، محبت اور خلوص کے نقوش میرے ذہن و دل پر ثبت ہیں۔ ایسے مضامین نہ تحقیقی ہیں، نہ تنقیدی ــــ یہ صرف یادیں ہیں اور احساسات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب شخصیات سے میں ذہنی طور پر وابستہ رہا ہوں، ان کے ساتھ زندگی کے بہت سے قیمتی لمحے گذارے ہیں اور تلخ و شیریں تجربات سے ہمکنار ہوا ہوں اور اسی وابستگی اور ذہنی قربت کا اظہار یہ مضامین ہیں۔

آخر میں کچھ مضامین چند اہم تاریخی اور ادبی شخصیات کے بارے میں ہیں جن کے مطالعے سے مجھے نئی روشنی ملی اور جن سے اظہارِ عقیدت کر کے مجھے ذہنی سکون کا احساس ہوا ہے۔

یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً سب سے پہلا مضمون نقوشِ دلی ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا اور سب سے آخری مضمون ہے ــــ "میرا مزاج لڑکپن سے ..." چند ماہ پیشتر لکھا گیا۔ ان مضامین میں کچھ ایسے اشخاص کا ذکر بھی ملے گا جو اس وقت بہ قیدِ حیات تھے جب مضمون لکھا گیا۔ مگر اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ــــ مثلاً مولانا خورشید عالم شیمی جن کا ۲۴ رمئی ۱۹۹۳ء کو انتقال ہو گیا۔

مجھے امید ہے کہ اہلِ نظر ان مضامین کو محض تذکرۂ واقعات نہیں بلکہ میرا ذہنی سفر نامہ تصور کر کے ملاحظہ فرمائیں گے۔ جس میں روحِ عصر ہر قدم پر جلوہ ریز ہے۔

رفعت سروش
۲۱؍جولائی ۱۹۸۳ء

سینیر پروڈیوسر
اردو مجلس۔ آل انڈیا ریڈیو
نئی دہلی۔

مرا مزاج لڑکپن سے

مرا مزاج لڑکپن سے نہ عاشقانہ تھا نہ شاعرانہ — بلکہ مصورانہ تھا۔ میرا بچپن ایک ایسے بے رنگ غبار میں لپٹا ہوا ہے جس کی کوئی تصویر میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے اور نہ کوئی سنی سنائی ایسی قابلِ ذکر بات ہے جسے دہرایا جا سکے نہ ماں باپ کے لاڈ پیار کے قصے۔ نہ بہن بھائیوں کے پیار محبت کی داستانیں۔ نہ اپنی ضدوں اور شرارتوں کی سنی سنائی باتیں بس — ایک سپاٹ — ان چاہا بچپن — جبرِ زندگی کا عنوان — نہ منتیں — نہ مرادیں — نہ آرزوئیں زیبِ داستان کے لیے یہ بھی لکھنے کا کوئی جواز نہیں کہ میرے گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ یا ادب و شعر میری گھٹی میں پڑے تھے۔ یا میرے فلاں — اور فلاں — مشہورِ زمانہ شاعر یا فنکار تھے۔ یا — "یہ" تھے۔ اور "وہ" تھے — میں اپنی داستانِ فکر و فن کی پہلی کڑی خود ہوں — دھول، مٹی اور جھڑکیوں اور ڈانٹ ڈپٹ میں لپٹا۔ لنھڑا — میرا بچپن — مجھے لڑکپن کی خاردار باڑھ پر

چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا۔ اور میں اس خار زار میں بھٹکنے لگا۔ شاید کسی گلزار کی تلاش میں ــــ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید یہ اسی تلاش و جستجو کا ثمرہ تھا کہ میں نے اپنے روایتی مکتب میں "الف، ب، ت، لکھنا سیکھنے سے پہلے گل بوٹے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ گھر میں جو کاغذ پڑا مل جاتا اس پر کیرم کارٹ نہیں ــ چھوٹے چھوٹے پتوں سے لدی شاخیں بناتا ــ میرا کھیل تھا ــ پھر اسکول میں اپنی کتابوں اور کاپیوں پر پھول بناتا رہتا ــ اور ہوتے ہوتے یہی گلکاری میری دلداری کا باعث بن گئی۔ مجھ سے رومالوں، تکیوں اور پلنگ پوشوں پر کاڑھنے کے لیے خوبصورت پھول بنانے کی فرمائشیں کی جانے لگیں اور پھر میں بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا ــــ نگینہ ــــ نہایت خوبصورت لفظ میرے وطن کا نام ہے۔ نگینہ میں تیسری کلاس تک پڑھا اور وہاں سے موانہ (ضلع میرٹھ) جانا پڑا جہاں میرے بڑے بھائی مولانا سید ممتاز علی (مرحوم) ایک اسلامی مکتب کے صدر مدرس تھے اور قاضئ شہر اور رہنمائے قوم کا درجہ رکھتے تھے۔ مکتب موانہ کی جامع مسجد میں ہی تھا اس لیے آدھا دن مسجد میں گذرتا اور خاص طور پر گرمیوں کی دوپہر میں مسجد کے صاف اور چکنے فرش پر کھیلنے میں بہت لطف آتا تھا ــــ مجھے مسجد کے گنبد اور مینار اور مخصوص فضا بہت اچھی لگتی تھی اور میں اپنے ذہن سے اختراع کر کے مسجدوں کے نئے نئے نقشے بنایا کرتا خاص طور پر ــــ میناروں کے نئے نئے ڈائزائین سوچا کرتا ــــ میں نے بھائی میاں سے کل ڈیڑھ سال پڑھا۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے مئی ۱۹۳۵ء تک (درجہ چار تک) اس عرصہ میں کوئی مخصوص تعلیم نہیں حاصل کی۔ سوائے کورس کی عام

کتابوں کے۔ مگر اسی عرصے میں میں نے ان سے خوش خطی سیکھی اور مضمون نگاری کے نکات ۔ یا محاورہ اُردو لکھنا۔ اور اس کے بعد مجھے کسی استاد کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔

گورنمنٹ مڈل اسکول (موانہ) میں داخلہ لینے کے بعد میرے مصورانہ مزاج کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اور میں نے مختلف طریقوں سے اپنے اس فطری مزاج کا اظہار کیا۔ پھول پتے اور نقش و نگار بنانا تو اب میرے لیے معمولی بات تھی اور ہرکس و ناکس سے مجھے اس کی داد مل چکی تھی۔ اب مجھے طغرے لکھنے اور ان کو تاج کمپنی کے دفتروں کی طرح مزین کرنے کا شوق ہوا۔ اس سلسلے میں موانہ کے ایک بزرگ خطاط سیف صاحب کے کتبوں اور طغروں نے بھی مجھے متاثر کیا مجھے اپنے بنائے ہوئے طغروں اور گل بوٹوں پر نمائشوں میں انعام بھی ملے۔ مگر جب گھر والوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں انسانی تصویریں بھی بنانے لگا ہوں اور شاہجہاں کی ایک تصویر پر مجھے انعام ملا تو فتو ی صادر ہوا۔ بھائی میاں نے سختی سے منع کیا کہ آئندہ کوئی ایسی تصویر نہ بناؤں کیونکہ ایسی تصویریں بنانا حرام ہیں۔ اور قیامت کے دن ان میں جان ڈالنی پڑے گی ــــــ بس وہ دن اور آج کا دن ـــــ میرا مصورانہ مزاج پھول پتوں اور گل بوٹوں کے نقش و نگار تک محدود ہوکر رہ گیا ـــــ مگر کچھ عرصہ بعد مصورانہ ذوق ۔ ذوق شاعری کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔

رکتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اس وقت موانہ کلاں (ضلع میرٹھ) ایک ایسا قصبہ تھا جہاں شہری زندگی کی جدید روشنی کا گذر بہت کم ہوا تھا۔ آبادی کا بیشتر حصہ کسانوں

محنت کشوں اور چھوٹے بڑے دوکانداروں پر مشتمل تھا۔ نہ کوئی مل تھا نہ کارخانہ۔ تعلیم بھی عام نہ تھی ۔ دو تین پرائمری اسکول ایک مڈل اسکول ایک کنیا پاٹھ شالہ اور آٹھویں درجہ تک ایک انگریزی اسکول ۔ سیر کرنے کے لیے آبادی سے کچھ دور۔ نہر گنگ کی شاخ انوپ شہر۔ اور ہمارے مڈل اسکول کے قریب ایک کمپنی باغ جس میں ٹاؤن ہال بھی تھا اور لائبریری بھی ۔ اس چھوٹے سے قصبہ کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔ اور خاص طور پر وہ فضا جس سے مجھے سابقہ تھا۔ ایک حد تک ادبی اور سیاسی تھی ۔ بھائی صاحب اپنے مکتب کے علاوہ گھر پر اعلیٰ قابلیت منشی اور کامل کے لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے اور درس کے دوران ادب و شعر کے ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے جن سے ادق سے ادق مضامین کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھی۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ اگرچہ میں ان درجات کا باقاعدہ طالب علم نہیں تھا مگر وہاں اٹھتے بیٹھتے جو غیر رسمی تعلیم حاصل کی وہ جزو مزاج بن گئی ۔ بھائی میاں کی دوسری اہم مصروفیت اور مشغولیت تھی جمعیۃ العلماء کی رہنمائی ۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے وہ چہیتے شاگرد تھے اور دارالعلوم دیوبند اور غلام بھیک نیرنگ کے تبلیغ کالج کرنال کے فارغ التحصیل ۔ انہیں تحریر و تقریر دونوں پر کامل عبور حاصل تھا اس لیے چند سال کے قیام کے دوران ہی وہ اس قصبہ کی روح رواں بن گئے تھے ۔ ۱۹۳۶ء کا الکشن ایک تاریخ ساز الکشن تھا جس میں جمیعتہ العلماء نے مسلم لیگ کے نمائندوں کی پیروی کی تھی ۔ جس حلقۂ میں مواتہ تھا وہاں یو۔پی اسمبلی کی سیٹ کے لئے کھیا رشید الدین اور مسلم لیگ کے

نمائندے محمد احمد کاظمی کا مقابلہ تھا۔ بھیا جی نے اپنی تجوری کا منہ کھول دیا۔ مگر جیت کاظمی صاحب کی ہوئی۔ اس الکشن کے سلسلے میں جو بھی جلسے ہوئے ان میں میں نے شرکت کی اور علمائے کرام اور رہنمایان قوم کی تقریریں سنیں بیرسٹر محمد اشرف اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی میں نے اسی زمانے میں دیکھا اور سنا۔ اور پھر یو۔ پی میں کانگریس سرکار بننے کے بعد جب کاکوری کیس کے قیدی چھوٹے تو رہائی پانے والوں میں موانہ کے بشنو شرن دبلش بھی تھے۔ رہا شدہ قیدیوں کے اعزاز میں نہایت شاندار جلسہ ٹاؤن ہال موانہ میں منعقد ہوا۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ مشاعرہ ہوا۔ پر جوش نظمیں ہوئیں۔ اور موانہ کی فضا کو حب الوطنی کے جذبات سے مملو کر گئیں۔ قصبہ میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ نہایت فعال تھی کچھ دنوں اس کے جنرل سیکریٹری میرے بھائی سید اشتیاق علی شوق رہے جو مجھ سے بڑے اور بھائی میاں سے بہت چھوٹے ہیں۔ بھائی میاں خود تو چونی کے ممبر بھی نہیں تھے۔ مگر ان کی حیثیت بیڈر گر کی سی تھی۔ جسے چاہا صدر بنوا دیا۔ جسے چاہا سیکریٹری کا عہدہ دلا دیا۔ اپنے لیے انھوں نے مکتب کا بوریا ہی پسند کیا۔ اور یہی ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا راز تھا انھیں قصبہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔

غرض یہ وہ ماحول تھا جس سے میرے دل و دماغ متاثر ہو رہے تھے اور جہاں میری تخلیقی صلاحیتیں نشو ونما پا رہی تھیں۔ ان دنوں بھائی اشتیاق علی شوق کے دوست اختر عباس تخلص جار چوی (جو آگے چل کر مشہور شاعر ہوئے اور چند سال پیشتر کراچی میں انتقال فرما گئے) جو میرٹھ پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں موانہ آیا کرتے تھے کیونکہ ان کے

والد منشی حیدر عباس موانہ ہی میں سکونت پذیر تھے اور تحصیل میں عرائض نویس تھے۔ نخشب اور بھائی اشتیاق سارا سارا دن شعر و شاعری میں گذار دیتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے سوچا کہ ایسی شاعری تو میں بھی کر سکتا ہوں۔

یہ اپریل ۳۸ء کی بات ہے۔ میرا اردو مڈل کا امتحان ہو چکا تھا اور میں اپنا وقت یونہی گذارتا تھا۔ کبھی کیرم کھیل لیا بھائی جان اور نخشب کے ساتھ، کبھی شرر اور صادق صدیقی کے ناول پڑھ لیے ــــ بس یونہی اوٹ پٹانگ ــــ ایک دن دو شعر موزوں کیے ہ ے

ہوئی جس طرف بھی نظر کی رسائی
نظر آئی ہر سو خدا کی خدائی
اگر گل دکھاتا ہے آثارِ نکہت
تو کرتا ہے گلچیں تشدد نمائی

شعر تو لکھ لیے مگر سناؤں تو کسے اور کیسے بھائی جان اور نخشب تو عاشقانہ قسم کی شاعری کرتے تھے۔ مجھے اپنے یہ شعر بہت پھیکے لگے اور میں نے کسی کو بھی نہ سنائے۔

آج سوچتا ہوں کہ یہ اشعار میرے بنیادی مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں اور اس ماحول کے غماز ہیں جس میں میں سانس لے رہا تھا ان کے پس منظر میں کا کوری کیس ــــ کانگریس کی جدوجہد آزادی ــــ غلامانہ ماحول ــــ مجھے مصوری ترک کرنے کی تلقین ــــ ذہنی گھٹن ــــ سب کچھ گڈ مڈ ہے ــــ سب کچھ جھلملا رہا ہے۔

جون ۳۸ء میں موانہ سے نگینہ آگیا ــــ اور اب میں نے اپنے اس وطنِ مولود کو نئی نظر سے دیکھا۔

نگینہ کی فضا موانہ سے بہت مختلف تھی۔ بڑا قصبہ شہری خوبو کے لوگ، اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے والے جاگیردار ــــ اپنی حویلیوں اور دیوان خانوں میں محصور ــــ اپنی کالی تجوریوں پر ناز کرنے والے ساہوکار ــــ اور عام لوگ ــــ جیسے انگریز کی غلامی کے دوران ہر جگہ کے عام لوگ ہوتے تھے۔ کچھ کچہریوں اور تھانوں سے رسم وراہ رکھنے والے اور پبلک کو بیوقوف بناکر اپنا الو سیدھا کرنے والے ــــ کچھ دستکار دوکاندار ــــ کچھ فقیر اور نادار ــــ نگینہ ایک ایسا قصبہ ہے جہاں کے لوگ اس زمانے میں بھی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں۔ یا ذاتی کاروبار کے سلسلے میں دور دراز کے شہروں میں جاتے تھے۔ مگر ان کے جذباتی رشتے اپنے آبائی وطن سے منقطع نہیں ہوئے تھے اس لیے دوران ملازمت بھی آتے جاتے رہتے تھے اور آخر میں وطن ہی میں آبستے تھے۔ اس وجہ سے وہاں کی زندگی میں تنوع تھا اور بڑے شہروں کی بہت سی خوبیاں اور خرابیاں وہاں موجود تھیں۔ اور یہاں موانہ سے نگینہ آکر میری وضع قطع بھی تیزی سے بدلی۔ سر پر انگریزی بال کترنے کی جگہ نہیں ــــ شرعی کی جگہ بڑے پائچوں کا پاجامہ ــــ اور اردو اسکول جگہ جگہ ــــ انگریزی اسکول ــــ والد صاحب (مرحوم) محلہ کی مسجد کے پیش امام تھے۔ محلہ والوں نے ان سے دو چار بار کہا کہ آپ کا لڑکا ننگے سر پھرتا ہے۔ انگریزی بال رکھتا ہے ــــ مگر ــــ نکلے ــــ سینگ کہاں سماتے ہیں ــــ کچھ انہوں نے چشم پوشی کی۔ کچھ میں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ آخر سمجھوتہ ہو گیا۔

ان دنوں نگینہ علم وادب کا مرکز تھا اور یہاں پائے کے عالم

طبیب اور شاعر موجود تھے۔ دارالعلوم قاسمیہ میں مولانا احمد سعید (مرحوم) اور کئی اور ایسے عالم درس دیتے تھے جن کو دیوبند میں بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ طبیبوں میں میرے پھوپھا حکیم مولوی یعقوب ، حکیم ارتضیٰ علی، حکیم عبداللہ انصاری اور حکیم خلیل وغیرہ ایسے حکیم تھے جن کی تشخیص و تجویز کی دور دور تک شہرت تھی۔ وکیلوں اور مختاروں کا ایک بڑا طبقہ تھا۔ جن کی قانون دانی اور جرح کا دور دور تک چرچا تھا۔ اور بعض کی شہرت لکھنؤ اور دہلی کی عدالتوں کے ایوانوں تک پہونچ چکی تھی۔ مثلاً حافظ محمد ابراہیم۔ (جو ہندوستان کے ایوان سیاست میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے) چیرمین سید توفیر حسین، سید محمد سبطین، مولوی ظہیر عالم — بابو رگھونندن سرن — اور مختاروں میں منشی ضمیر احمد اور شبیر حسین — اور دوسرے بہت سے جو نگینہ کے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے اور جن کی وجہ سے قصبہ کا ماحول سنجیدہ اور پروقار رہتا تھا۔ اگرچہ اختلافات کی زیریں لہر بھی موجزن رہتی تھی جو کسی کی پگڑی اچھالنے کے لیے نہیں۔ بلکہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے تھی — کبھی محلہ سید واڑہ کو سبقت حاصل ہو جاتی اور کبھی قاضی سرائے کو — سید واڑے میں اکثریت ملازمت پیشہ لوگوں کی تھی جو نگینہ میں تو کم — مگر دور دراز شہروں میں زیادہ ملازمت کرنے گئے — زیادہ تر پولیس اور ریل کے محکموں میں — اس کے برعکس قاضی سرائے کا علمی طبقہ انگریزی تعلیم و تمدن کا مخالف تھا اور مشرقی علوم کے اکتساب کو ہی سرمایۂ حیات سمجھتا تھا — جاگیروں کی آمدنی نے اس طبقہ کو فکرِ معاش سے بے نیاز

کررکھا تھا۔

ایسے ماحول میں شعروشاعری کا چرچا ہونا قدرتی بات ہے چنانچہ نگینہ میں محلہ محلہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اور عوام جوق در جوق ان مشاعروں میں جاتے تھے اور اپنی سخن فہمی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مگر جدید رنگ سخن اور نئے تقاضوں کی لہر نگینہ تک نہیں پہونچی تھی۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے جب اُردو ادب کا نیا منظر نامہ ترتیب دیا جارہا تھا ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قایم ہوچکی تھی اور دو ڈھائی سال میں یہ تحریک کلکتہ سے لاہور تک پہونچ چکی تھی۔ غزل کا طلسم ٹوٹتا جارہا تھا اور جدید نظم نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ ہر محفل سخن میں جلوہ ریز تھی۔ انقلابی جلسے ولولہ انگیز نظموں سے شروع ہوتے تھے۔ مگر نگینہ کی بساطِ ادب بہت پرانی تھی۔ روایتی آداب کے ساتھ طرحی مشاعرے امرائے شہر کے دیوان خانوں میں منعقد ہوتے تھے اور شہر کے مشاہیر میں معاصرانہ چشمکیں بھی ہوتی تھیں۔ کہ یہ بھی ایک روایت تھی ـــ ان دنوں دو استاد سخن تھے جو اپنے شاگردوں کے ساتھ مشاعروں میں آتے تھے اور اپنا اپنا رنگ جمانے میں اپنی تمام صلاحتیں صرف کردیتے تھے ـــ ایک مولانا اختر نگینوی ـــ شاگردِ داغ اختر نگینوی بہت بزرگ تھے میدہ سا رنگ ـــ دراز قد ـــ کتابی چہرہ ـــ شیروانی اور چوڑے پائچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی ـــ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ ان کو مشاعرے کے اختتام کے وقت ہی زحمتِ سخن دی جاتی تھی۔ زبان کے شعر کہتے تھے۔ پڑھتے وقت ان کا بایاں ہاتھ کچھ زیادہ حرکت کرتا تھا۔ جو نہایت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی شمولیت سے مشاعرہ کے وقار میں

اضافہ ہوتا تھا۔ صاحبِ دیوان تھے۔ انوار اختر۔ ضیائے اختر ـــــ وغیرہ ان کے کئی دیوان چھپ چکے تھے۔ ان کے قریبی عزیز غضنفر نگینوی تھے۔ اور چند اور شعرا جو سرائے میر ادر محلہ سید واڑے میں رہتے تھے ـــــ دوسرے استاد شاعر تھے۔ بابو فخرالدین محزون۔ ان کی قلمرو میں محلہ قاضی سرائے اور محلہ لوہاری سرائے تھے۔ محزون صاحب حکیم ارتضیٰ علی کے داماد تھے اور ٹونک اور دہلی سے ملازمتیں ترک کرنے کے بعد نگینہ آبسے تھے۔ انھیں محفل آرائی کا جنون کی حد تک شوق تھا اور اپنا سارا وقت شعرگوئی میں صرف کرتے تھے۔ ایک ایک مصرعہ پر سیکڑوں شعر کہتے اور بہ قدر درجات اپنے شاگردوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ان کی اس فیاضی نے ان کے گرد و نواح میں رہنے والے ہر نیسرے نوجوان کو شاعر بنا دیا تھا۔ مشاعروں میں وہ خود شعر نہ پڑھتے تھے بلکہ خوش الحال لڑکوں سے اپنی غزل پڑھوایا کرتے تھے۔ اس شان سے کہ اسٹیج پر دولھا بنے بیٹھے ہیں۔ غزل خواں لڑکا شعر پڑھ رہا ہے اور داد وصول کر رہے ہیں بابو جی ـــــ ان کی غزل کا خاص انداز تھا اگر اختر صاحب زبان کی شاعری کرتے تھے تو بابو فخرالدین محزون مضمون آفرینی کرتے تھے ؎

بگولہ بن کے شاید اڑ رہی تھی قیس کی ہستی
جسے صحرا میں سمجھا تھا غبارِ کارواں میں نے

ان کے شاگردوں میں قابل ذکر تھے بسمل نگینوی اور ماسٹر ـــــ مختار احمد اور ان شاعر لڑکوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی جنھیں محزون صاحب غزل عطا کیا کرتے تھے ـــــ ایک جاتا اور چار آتے ـــــ محزون صاحب کی اس سخاوت سے اچھی خاصی چہل پہل ہوگئی تھی

مگر مجروح صاحب کا طلسم توڑنے کے لیے اختر صاحب کے محلسرائے میں سے ایک طرحدار نوجوان ــــ جس نے قیامت کا ترنم پایا تھا ــــ صاحب عالم فانی الکاظمی (جو اب نجمی نگینوی کے نام سے مشہور ہے اور لاہور میں مقیم ہے) نمودار ہوا۔ وہ علی گڑھ کی ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور اس زمانے میں شکیل بدایونی اور راز مرادآبادی کی وہ تازہ تازہ غزلیں جو علی گڑھ سے نکل کر نگینہ تک نہ پہونچی تھیں ــــ اپنے نام سے منسوب کر کے نہایت بانکپن اور خود اعتمادی کے ساتھ سناتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ نگینہ کے عوام کا مقبول ترین شاعر بن گیا ان غزلوں اور نظموں کے طفیل میں، جو اس کی تھی ہی نہیں ــــ مثلاً شکیل کی نظم ــ تصادم ــــ چور ــــ تیسرا گھنٹہ ــــ اور وہ غزل ؎

چاندنی میں رخِ زیبا نہیں دیکھا جاتا

ماہ و خورشید کو یک جا نہیں دیکھا جاتا

یا وہ غزل ؎

اے روح جو ممکن ہو تو پھر تن میں سما جا

آیا ہے کوئی پرسشِ بیمار کی خاطر

بہر حال یہ راز تو بعد میں کھلا کہ فانی الکاظمی چوری کا کلام پڑھ کر مشاعرے میں اپنے جھنڈے گاڑتے تھے ــ وہ طرحی مشاعروں میں طرحی کلام ختم ہونے کے بعد ــ تبرک کے طور پر اپنی غیر طرحی غزل ہی پڑھتے تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ــــ واقعہ یہ ہے کہ مجروح صاحب کے ایوانِ مقبولیت کے ستون ہلنے لگے فانی کی وجہ سے اور گھبرا کر مجروح صاحب نے ایسا ہلکا پھلکا کلام کہنا شروع کر دیا جسے قوال آسانی سے گا سکیں۔ اس گروہ بندی کے علاوہ نگینہ میں چند سنجیدہ شاعر اور بھی تھے

جنھیں نہ مشاعرہ بازی کا شوق تھا نہ شہرت کی دوکان سجانے کا ـــــ مولانا نورشید عالم شیمیؔ، نورالہدیٰ گلچیںؔ، محمود الرحمٰن عندلیبؔ اور مولوی محمود گلؔ ـــــ یہ وہ چند نام تھے جو غالباً نگینہ کے اس گلدستۂ سخن سے متعلق تھے جو کچھ سال پیشتر ترتیب دیا گیا ہو گا۔ اب یہ منتخب محفلوں ہی میں آتے تھے اور انھیں کسی کی مقبولیت یا نامقبولیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

یہ تھا نگینہ کے ماحول کا اجمالی جائزہ جس نے میرے مزاج کو مصورانہ سے شاعرانہ بنا دیا ـــــ میں مشاعرہ کی اکھاڑہ بازی میں کس طرح داخل ہوا ـــــ یہ بھی دلچسپ قصہ ہے ـــــ

میں نگینہ آکر ایم۔ بی۔ انگلش اسکول میں داخل ہوا تو چند روز میں ہی ہم سبقوں میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ بابو فخرالدین مخزوںؔ کا لڑکا اقبال (مرحوم) جو بہت لجلجا سا تھا۔ میرا ہم سبق تھا ایک دن معلوم ہوا کہ ظہیر عالم صاحب کے دیوان خانے میں مشاعرہ ہونے والا ہے اس مشاعرے میں اقبال بھی غزل پڑھے گا ـــــ طبیعت میں طرارہ آیا کہ اگر اقبال غزل پڑھے گا تو میں بھی کیوں نہ پڑھوں ـــــ مصرعہ طرح تھا ـــــ نہ دیا لاکھے کیا کیا زمین و آسماں میں تے

فوراً ایک غزل گھڑی اور بابو فخرالدین احمد مخزوںؔ کے پاس اصلاح کے لیے لے گیا کہ وہی گھر کے قریب رہتے تھے۔ مخزوںؔ صاحب نے غزل رکھ لی اور تیسرے دن اپنے لکھے ہوئے شعر عطا فرما دے مگر مجھے وہ بخشی ہوئی غزل بالکل پسند نہ آئی۔ اور میں نے اپنی ہی غزل مشاعرے میں پڑھی۔ اور میں انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ سید شوکت

علی سے سید شوکت علی شوکتؔ نگینوی بن گیا اور نگینہ کی فہرستِ شعرا میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا ___ اس پہلی غزل کے کچھ شعر یاد ہیں ؎

نہ دیکھا آج تک دنیا میں کوئی شادماں میں نے
جہاں پہونچا وہیں پایا نیا اک آسماں میں نے

زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے برگِ افتادہ
بڑھائی تھی کسی دن زیبِ صحنِ گلستاں میں نے

نگاہِ شوق سے دیکھو۔ یہ دنیا درسِ عبرت ہے
غلط فہمی تھی سمجھا تھا اسے جنت نشاں میں نے

مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے اور غزل سازی کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر میری یہ غزلیں مذاق عوام کے مطابق نہ تھیں۔ وہاں نودر کار تھی۔ چٹاخ پٹاخ قسم کی شاعری ___ اور میں بے استاد شاعر اور اپنی افتادِ طبع کا مارا ہوا ___ نہ حکایتِ خم کاکل سے سروکار ___ نہ بیانِ لب و رخسار ___ میں کبھی مناظر قدرت کو اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کرتا کبھی فلسفیانہ انداز بیان اپنانے کی سعی کرتا ___ انقلابی آہنگ بھی مجھے مرغوب تھا ___ ایک بار مصرعہ طرح ہوا۔

وہ عالم ہے غرورِ حسن و پندارِ جوانی کا

میں نے ایک انقلابی نظم اس طرح لکھ ماری کہ ہر بند کا پانچواں اور چھٹا مصرعہ طرح میں تھا ؎

غلامِ ہند اب بیدار ہو ہے وقتِ بیداری
غلامی کا ہے تجھ پر کس لئے اثر طاری

تجھے برباد کر دے گی یہ تیری سہل انگاری
مجبِ قوم بن جاتا یہ کے یہ ذلت وخواری

غضب اس پر یہ ہے اظہار ہے پھر شادمانی کا
سمجھتا ہے اسے تو مژدہ فتح و کامرانی کا

تھی تو یہ اوٹ پٹانگ نظم ــ مگر محزوں صاحب کے شاگردوں پر بجلی کی طرح گری ۔ مختار صاحب نے کہا کہ یہ جوش کی نظم ہے ۔ مجھے غصہ آیا اور چیلنج کر دیا کہ ہو جائے فی البدیہہ مشاعرہ ـــ اور مخالفوں کو منہ کی کھانی پڑی ۔ فی البدیہہ غزل فانی الکاظمی سے لوہا منوانے کے لیے بھی کہنی پڑی ـــ ان دنوں اقبال، جوش اور احسان دانش میرے پسندیدہ شاعر تھے اور نگینہ میں دارالمطالعہ ہونے کی وجہ سے ہر شام وہاں گذرتی تھی ۔ ہمایوں، زمانہ، مسافر (مراد آباد) مست قلندر (لاہور) اور دوسرے اہم رسالے پڑھنے کو مل جاتے تھے اس لیے میں جدید رنگِ سخن سے بھی آشنا ہو چلا تھا ـــ اسی دوران میری ملاقات مولوی خورشید عالم شمیمی سے ہوئی جو میرے بڑے بھائیوں کے دوست تھے ۔ انھیں میں نے اپنی غزل دکھائی ــ انھوں نے ایک آدھ لفظ ادھر ادھر کر کے کہا کہ یہ غزل کہاں سے نقل کی ہے ۔ میری انا کو پھر ٹھیس پہونچی ۔ میں نے کہا غزل میں نے ہی کہی ہے ۔ اس غزل کے کچھ شعر یہ تھے ؎

ٹھکرا دیا ہے ہستئ ناپائیدار کو
سمجھا ہوں کھیل کشمکشِ روزگار کو

میں ڈھونڈتا ہوں شمعِ تجسس لیے ہوئے
گذری ہوئی حیات کے نقش و نگار کو

مے بھی ہے، میکدہ بھی ہے، جام و سبو بھی ہے
ساقی نہیں تو آگ لگا دو بہار کو

اک حشرِ اضطراب بپا میکدے میں ہے
ساقی نے کیا پلا دیا ہر بادہ خوار کو

ہر شخص حسن و عشق کے نشے میں چور ہے
سنتا نہیں ہے کوئی وطن کی پکار کو

کیا پوچھتے ہو شوق اسیرانِ نو کا حال
حسرت سے تک رہے ہیں چمن کی بہار کو

جب شمیمی صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ میری ہی غزل ہے تو انھوں نے بہت ہمت افزائی کی اور مجھے مشورہ دیا کہ نظمیں کہا کروں — اور پھر میں نے بہت سی نظمیں کہیں — دو شیزۂ چمن — مسکرائے جا، پیامِ شوق اور بہت سی نظمیں — معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اپنی غزلیں اور نظمیں رسائل کو بھیجیں اور چھپنے لگیں جب میرا کلام فطرت (لاہور) مست قلندر، شمع (دہلی)، تیج (دہلی) اور مسافر (مرادآباد) میں چھپنے لگا تو مخالفین کا منہ خود بخود بند ہو گیا۔ اب میں واحد نگینوی شاعر تھا جس کا کلام رسائل میں چھپتا تھا — آہستہ آہستہ میں نے قصبہ کے طرحی مشاعروں میں شرکت کرنی چھوڑ دی۔ اور اپنے دو ایک شاگرد بنا لیے جن کو غزلیں دے کر مشاعرے لوٹنے کے لیے بھیج دیتا تھا۔

پھر کچھ عرصے کے لیے میرا جی شاعری سے اچاٹ ہو گیا۔ دوسری

جنگِ عظیم شباب پر تھی ضروریات زندگی گراں تر ہوتی جا رہی تھیں ۔ ادھر میرے والد کا انتقال ہوگیا ۱۹۴۲ء میں۔ مجھے ہائی اسکول تک پڑھنے کے لیے Merit scholarship قابلیت کا وظیفہ، ملتا تھا۔ آٹھ روپیہ ماہوار پہلے تو بہت تھا۔ مگر جب گرانی تیزی سے بڑھی تو مجھے فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ میں نے اپنی گل کاری کو وقتی طور پر ضمنی پیشہ بنالیا۔ تکیوں اور چادروں پر کشیدہ کاری کے لیے نقشے بناتا اس کے علاوہ بٹر پیپر پر سوراخ کر کے طرح طرح کے گل بوٹے بنا کر بیچتا— اس زمانے میں اس کا بڑا چلن تھا۔ اور میرے بیل بوٹے شاید بازاری کتابوں کے بوٹوں سے بہتر تھے اس لیے خوب بکتے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک جاری رہا اور ۱۹۴۴ء میں جب ایک بار مجھے دہلی میں بیکار رہنا پڑا تو پھر میں نے نئی سڑک کے دوکانداروں کو نئے نئے ڈیزائن کے بوٹے بیچے اور پیٹ بھرا۔

روٹی تو کسی طرح کما کھائے مچھندر

شاعری سے کچھ دن کے لیے گریز میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا جنگِ عظیم کی چیرہ دستیوں نے لباسِ زندگی کو تار تار کر دیا تھا۔ پرانی قدریں پاش پاش ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ روایتوں کے جھنڈے اڑتے نظر آرہے تھے۔ بغاوتوں کے پرچم بلند ہو رہے تھے۔ زندگی آگ اور خون کا کھیل کھیل رہی تھی۔ ہر طرف بھوک منڈلا رہی تھی ایسے میں غمِ کاکل اور لب و رخسار زدہ شاعری دشمنِ جاں معلوم ہوتی تھی۔ میرا دل اور ذہن کسی انجانے ہیجان کا شکار تھا۔ تیز رو خیالوں کو پیرایۂ اظہار نہیں مل رہا تھا۔ سو چا کہ غزل کی خواب آور فضا کو بدلنے کے لیے منا ظموں کی طرح ڈالی جائے۔ اور بجائے مصرعہ طرح کے نظموں کے عنوانات

دیئے جائیں اور ایک نئی نسل تیار کی جائے جو اس جاگیرداروں ، اور ساہوکاروں کے دنیا نوسی قصے میں اپنے خیالات سے نئی روح پھونک سکے۔ بابو رگھو نندن سرن وکیل سے اس بارے میں بات چیت ہوئی اور وہ ہماری ہفتہ وار نشستوں کے لیے اپنے مکان کا ایک کمرہ دینے پر راضی ہو گئے۔ میرے ہم خیال نوجوانوں میں پیش پیش تھے یوسف اقبال، پھر ان کے ساتھ قیام الدین مضطر اور مسعود صدیقی اور دو چار نوجوان اور۔ پہلا مناظرہ ہوا جس کا عنوان تھا ۔ کشتی ۔ دوسرا مناظرہ ہوا ۔ جس کا عنوان تھا ۔ ستارے " اور اس طرح نوجوانوں میں ذوقِ نظم گوئی فروغ پانے لگا ۔ یوسف اقبال نے ایک بہت اچھی نظم کہی ۔ کبڈی ۔ میں نے بھی مناظر فطرت کی گود میں پناہ لی ۔ پے در پے بہت سی نظمیں کہیں ۔ اپنے تخلص شوکت سے روایت کی بو آتی تھی ۔ بدل کر سرورشؔ رکھ لیا ۔ پھر پورا نام بدل ڈالا ۔ اور رفعت سروشؔ قلمی نام اختیار کیا ۔ اور یہی اب میرا نام ہے ۔ اب جب کوئی مجھے شوکت کہہ کر پکارتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میرا ماضی مجھے آواز دے رہا ہے ۔

جون ۱۹۴۲ء میں نگینہ میں ایک خوشگوار واقعہ ہوا ۔ آل انڈیا انصار کانفرنس میں اختر الایمان آئے ۔ انھوں نے اپنی تقریر اور نظموں سے ہم نوجوانوں کو بہت متاثر کیا ۔ کانفرنس کے اسٹیج سے اختر نے اپنی نظمیں نقش پا اور محلکے سنائیں ۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا مضطرب ذہن کچھ اسی قسم کی آواز کی تلاش میں تھا ۔ چند ماہ بعد اختر پھر نگینہ آئے اور گرداب" کی سب نظمیں سنائیں ۔ اس وقت تک ان کا مجموعہ گرداب " چھپا نہیں تھا ۔ ہم سب کو اختر کا تازہ اور تیکھا لب و لہجہ بہت پسند آیا ۔ مگر اس کی ملہم کیفیت اور شدید

یاسیت سے میں نے انحراف کیا۔ اور اپنی دانست میں ایسی نظمیں کہیں جو میرے مصورانہ مزاج کی عکاسی کرتی تھیں اور جن کی نوک پلک کو غزلوں کے اشعار کی طرح سنوارا گیا تھا ــــ دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول کا ششماہی امتحان تھا۔ ہم لوگوں نے اسٹرائک کر دی گھر سے یہ کہہ کر نکلتے کہ اسکول جا رہے ہیں اور پورا دن میں اپنے آم، امرود کے باغ میں گذارتا ــــ روز ایک نظم کہتا ــــ میری یہی نظمیں میری شاعری کے لیے نشاۃِ ثانیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں میں نے مصوری کی ہے مگر برش سے نہیں ــــ قلم سے رنگوں سے نہیں، لفظوں سے۔

(گلاب کا پھول)

کھلا ہوا ہے جھاڑیوں میں پھول اک گلاب کا
اٹے ہوئے غبار میں ہیں جس کے عارض و جبیں
کچو کے دے رہے ہیں خار خنجروں سے پے بہ پے
لہو لہان ہے تمام اس کا جسم نازنیں
ے اڑیں یہ دھند میں لپٹی ہوئی خاموشیاں
شام کی سرمست دوشیزہ کا البیلا شباب
سرمئی ہونٹوں سے رخسارِ شفق کو چوس کر
کر دیا تاریکیوں نے بے مزہ، بے آب و تاب

ٹمٹما کر بجھ گئے فانوس بھی ذرات کے !
اب فلک کی آنکھ میں بھی روشنی باقی نہیں
چل گیا فطرت کا جادو طاقت گفتار پر (اندھیری رات)
زمزموں کی ندیاں بھی بہتے بہتے رک گئیں

قصرِ تہذیب ہے ویران کھنڈر کی صورت
نظر آتے ہیں ہر اک سمت بھیانک نقشے
ٹمٹماتا ہوا مٹی کا دیا کبھی تو نہیں
ہانپتی کانپتی جس سے کوئی لَو ہی نکلے
(تلاطم)

دور تک کچی منڈیروں کا بھیانک منظر
جیسے افلاس کا مارا ہوا اک جمِ غفیر
بھاگ آیا ہے کسی قحط زدہ بستی سے
جس کا ہر فرد ہے اندوہ و الم کی تصویر

ڈھونڈتا ڈھونڈتا کھانے کیلئے کوئی شئے
ایک سنسان بیاباں میں نکل آیا ہے
اور ہجومِ غم و حرمان و تہی دستی سے
چرخ کو دیدۂ حسرت سے کھڑا تکتا ہے
(گاؤں)

وقتِ سحر، خاموش دھندلکا ناچ رہا ہے صحنِ جہاں میں
تابندہ پر نور ستارے جگ مگ جگ مگ کرتے کرتے
ہار چکے ہیں اپنی ہمت، ڈوب چکے ہیں بحرِ فلک میں
تاریکی کے طوفانوں میں اپنی کشتی کھیتے کھیتے
لیکن اک باہمت تارا اب بھی آنکھیں کھول رہا ہے
اب بھی جہاں کو دیکھ رہا ہے اپنی مستانہ نظروں سے
(نجمِ سحر)

جیسے کسی تالاب میں چمکے کوئی شگفتہ پھول کنول کا
جیسے بیلے کی شاخوں میں دور سے ایک شگوفہ چمکے

یہ اور اس طرح کی دوسری نظمیں جب میں نے اس وقت کے صف اول کے رسائل کو بھیجیں تو مدیران کرام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ۴۳ء میں یہ نظمیں "ہمایوں"، "ادبی دنیا"، "شاہکار"، "نیرنگ خیال" جیسے رسائل میں چھپیں اور جدید سخنوروں کی محفلوں میں انھیں سراہا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ مسافر کو منزل کا سراغ مل گیا ہے اور اگست ۴۳ء میں جب میں دہلی آیا تو اس وقت دلی کی ادبی محفلوں سے میرا تعارف کرانے والی میری یہی نظمیں تھیں۔ وہ محفلیں جن میں اختر الایمان بھی تھے اور خورشید الاسلام بھی، مجاز بھی تھے اور نہال سیوہاروی بھی، حسن عسکری بھی تھے اور عطا محمد شعلہ بھی ــــ جمیل الدین عالی بھی تھے اور مختار صدیقی بھی ــــ میری شاعری چالیس سال میں ایک طویل سفر طے کر چکی ہے۔ اور مختلف سمتوں میں ــــ مگر میرا مصورانہ مزاج میری شاعری سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ اس کی تفہیم کے بغیر میرے شعری رویوں کا جائزہ لینا محال ہے۔ غزل ہو یا نظم منظوم ڈرامہ ہو یا اوپیرا ــــ میری ہر تخلیق میں مصوری اور پیکر تراشی ایک زیریں لہر کی طرح موجزن ہے۔

نقوشِ دلّی

(۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک)

دوسری جنگِ عظیم نے چاہے دنیا میں کتنی ہی تباہی مچائی ہو۔ لیکن اس کے سبب دلی کی رونق میں چار چاند لگ گئے تھے۔ محکمۂ جنگ سے متعلق مختلف دفتروں میں ملازمت کرنے کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ کھنچ کھنچ کر دلی آ رہے تھے اور اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور دیگر خصوصیات ساتھ لائے تھے جن کا اثر دلّی غیر ارادی طور پر قبول کر رہی تھی اور اس کی مخصوص فضا اور تہذیبی زندگی ایک خاموش انقلاب سے دوچار ہو رہی تھی جس کا اثر زبان و ادب پر پڑنا ناگزیر تھا۔

تلاشِ معاش میں میں بھی جولائی ۱۹۴۳ء میں اپنے وطن نگینہ (ضلع بجنور) سے دہلی آیا۔ دلّی کا قلب وسیع ہے اور دامن کشادہ اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح مجھے بھی اس کے دامن میں جگہ ملی اور میں کلرکوں کے اس جمِ غفیر میں شامل ہو گیا جس میں ایک سے ایک نمایاں شخصیت تھی۔

نہال سیوہاروی، شکیل بدایونی، عطا محمد شعلہ، ضمیر اظہر، ظریف دہلوی ۔
اور نہ جانے کتنے لوگ سانگ پبلسٹی ڈویژن اور رسالہ آج کل میں تھے ۔
جیسے حفیظ جالندھری، شبیہ الحسن بختیاری، سروش، جلال مالیر کوٹلوی،
آغا یعقوب دواشی، جذبی، خورشید الاسلام، فیض احمد فیض، چراغ حسن
حسرت فوج میں تھے ۔ اور مجاز ہارڈنگ لائبریری میں مختار
صدیقی، راز، مراد آبادی، محمد حسن عسکری وغیرہ وغیرہ سبھی
موجود تھے ۔

غرض اس وقت دلی غالب اور ذوق اور مومن اور داغ کی ہی دلی
نہیں تھی ۔ بلکہ یہاں دہلی کے علاوہ یوپی اور پنجاب کے اہل کمال بھی کافی
تعداد میں موجود تھے ۔

دہلی میں پردیسیوں کی افراط اور مکانوں کی سخت قلت تھی ۔ مجھے بہ مشکل
تمام اردو بازار میں محلہ مچھلی والان گلی خان خاناں میں ایک بیٹھک کرائے
پر ملی تھی ۔ اور میں نے اس جگہ کو پاکر اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اردو بازار
ہی ادیبوں اور شاعروں کی جولانگاہ تھا ۔ اُردو بازار اور اس کے قرب
وجوار میں یوں تو ہر دوکان اور ہر چائے خانے میں دو چار شاعر بیٹھے نظر
آجاتے تھے ۔ مگر اس وقت شاعروں کے مخصوص مرکز تھے ۔ ایک مکتبۂ
علم و ادب جہاں ساقی گروپ بیٹھتا تھا ۔ یعنی شاہد احمد دہلوی، محمد حسن عسکری ۔
اشرف صبوحی، تابش دہلوی، نہال سیوہاروی، اور حزیں امروہوی
وغیرہ ۔ یہ گروپ اور لوگوں سے زیادہ سروکار نہ رکھتا تھا ۔۔۔ دوسرا
مرکز چمنستان بکڈپو تھا ۔ جہاں سے ماہنامہ چمنستان نکلتا تھا ۔ آغا شاعر
قزلباش کے صاحبزادے آغا سرخوش قزلباش اس کے مالک تھے ۔ اور

یہاں بیٹھنے والوں میں مخشب جارچوی، شکیل بدایونی، محشر بدایونی اور صابر دہلوی وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ وار پبلسٹی کے آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرا دہلی سے گذرتے تو چمنستان ضرور آتے ـــــ تیسرا مرکز تھا۔ مولانا سمیع اللہ صاحب قاسمی کا مکتبہ عزیزیہ اگرچہ یہاں مستقل بیٹھنے والے تو مولوی حضرات ہی تھے۔ پانچ چھ یار دوستدار شعرا۔ مگر چونکہ مکتبہ عزیزیہ تقریباً ساری رات کھلا رہتا تھا۔ اس لیے رات کو دوسرے کتب خانے بند ہونے کے بعد لوگ آہستہ آہستہ یہیں جمع ہو جاتے۔ چار جاتے دس آ جاتے۔ مولانا کی بے نیازانہ مسکراہٹ سب کا استقبال کرتی۔ غپ شپ جاری رہتی اور رات گئے تک مکتبۂ عزیزیہ میں چہل پہل نظر آتی۔ یہ غپ شپ اردو بازار کی خاص چیز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو کوئی کام نہیں ہے اور وقت کاٹنے کے لیے دوکان پر آ بیٹھے ہیں۔ ان بیٹھکوں اور چائے خانوں میں سیکڑوں ادیب بیٹھتے تھے مگر محض وقت ضائع کرنے کے لیے۔ نہ کوئی علمی گفتگو ہوتی، نہ کوئی مفید نظریاتی بحث۔ سوائے کبھی کبھار غزل سرائی کے ـــــ اور ایک اُردو بازار پر ہی کیا موقوف۔ یہ بات پوری دلی پر صادق آتی ہے۔ دنیا ایک عظیم انقلاب سے گذر رہی تھی۔ سیکڑوں سال پرانی اقدار زندگی بے معنی نظر آنے لگی تھیں مگر دلی، وہی پرانی دلی تھی۔ اپنے حال میں مست ـــ جیسے بکھرا فردا نہ تھی۔ دنیا میں نئی ادبی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھیں مگر دلی کے اہل زبان سائل دہلوی اور بیخود دہلوی کے تنازعوں میں الجھے ہوئے تھے اور مشاعروں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ان کے نزدیک انتہائے کمال تھا۔ اس شہر میں نہ کوئی ایسا ادبی مرکز تھا جہاں سب اہل قلم مل جل سکیں۔ نہ کوئی ایسی ادبی انجمن تھی۔

جہاں اپنی تازہ تخلیقات پیش کی جا سکیں اور ان پر تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔

بارڈنگ لائبریری میں فصیح الدین احمد — پندرہ روزہ نشست کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کی چند نشستوں میں مجھے بھی شرکت کرنے کا اتفاق ہوا اس میں مخصوص دعوت ناموں پر مشاہیر بلائے جاتے تھے۔ یہی کوئی دس بارہ آدمی — اور بہت سرد ماحول میں لوگ بے دلی سے اپنے مضامین، نظمیں یا غزلیں سناتے تھے جیسے حکم کی تعمیل کر رہے ہوں۔ کبھی کبھار کسی کے منہ سے اتفاقیہ واہ نکل جاتی تھی۔ نہ ستائش، نہ تنقید۔ مجاز اس لائبریری میں ملازم تھے اس لیے وہ ہر نشست میں ضرور ہوتے تھے۔ مگر ان بیچارے پر بھی فصیح الدین احمد کی پارعب شخصیت چھائی رہتی تھی۔ فصیح الدین احمد کو تختشب جارچوی سے بہت لگاؤ تھا۔ اور انھیں کی سفارش پر شانتا رام تختشب کو اپنے ساتھ فلمی گانے لکھانے لے گئے تھے۔

دوسری قابل ذکر نشست اردو مجلس کے نام سے مٹیا محل میں نواب خواجہ محمد شفیع کے مکان پر ہوتی تھی۔ (اب اس مکان میں بیگم حبیبہ قدوائی رہتی ہیں۔ اور وہاں ایک ماتا سنیٹر بھی قائم ہے)۔ اردو مجلس میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ ع

صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کیلئے

عصر، مغرب کے درمیان نثر کی چیزیں سنائی جاتی تھیں اور بعد نماز مغرب بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ نثر کی محفل، محفلِ شعر سے بہتر اور مختصر ہوتی تھی بزم نثر میں کبھی کبھی خواجہ حسن نظامی بھی آتے تھے۔ اور خواجہ محمد شفیع دلی کی ٹکسالی زبان میں افسانے سنایا کرتے تھے۔ اردو مجلس کے جلسوں میں خواجہ محمد شفیع کی زندہ دلی، بذلہ سنجی اور نوابیت کا رنگ

چھایا رہتا تھا۔ فقرہ بازی اور پھبتیاں کہنے میں خواجہ صاحب کو کمال حاصل تھا۔ کبھی کبھار خواجہ صاحب کی محفلوں میں مشاہیر ادب بھی آجاتے تھے۔ مگر ان کی عام محفلوں کا ایک خاص رنگ تھا۔ جامع مسجد کے قریب وجوار میں رہنے والے اکثر شعراء ان کے یہاں پابندی سے جاتے تھے۔ ان کی محفل میں ایک مخصوص قدیم رنگ کی غزلیں پسند کی جاتی تھیں جن میں زبان دبیان کا چٹخارہ ہوتا تھا۔ رعایت لفظی اور محاورہ بندی کو کمال فن تصور کیا جاتا تھا۔ ہم جیسے نظم گو شعرا تو وہاں محض اہل محفل کو بور کرنے کے لیے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی محفلوں کے ساتھ جن لوگوں کا تصور آتا ہے وہ ہیں۔ قربت دہلوی، اختر بچھوندوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فیض جھنجھانوی، بسمل شاہجہاں پوری، ماہر دہلوی (نابینا) طالب دہلوی ــــ اور نوجوانوں میں نقا امروہوی، شیدا گجراتی شیدا خورجوی، آفاق دہلوی، نور سیوہاردی، فرید جاوید، گلزار دہلوی عطا محمد شعلہ اور جمیل الدین عالی وغیرہ وغیرہ ــــ اختر بچھوندوی سے خواجہ صاحب خاص تفریح لیتے تھے۔ اور استاد مضمحل اور استاد ہلاک جیسے مہمل گو بھی خواجہ صاحب کی محفل میں پابندی سے جاتے تھے۔ جہاں محفل میں ذرا سنجیدہ فضا قائم ہوئی تو انہیں حضرات کے سہارے خواجہ صاحب اس سنجیدگی کو درہم برہم کر دیتے تھے۔

ادبی بالیدگی کے نقطۂ نظر سے ردو مجلس کی نشستیں بے مصرف ہوتی تھیں کیونکہ یہاں عام طور پر وہ ادب نہیں پیش کیا جاتا تھا جسے وقت کی دھڑکنوں کا ترجمان اور زندہ ادب کہا جا سکے۔ ادبی مباحث اور تنقید کا تو خیر تصور ہی نہیں تھا۔ ان جلسوں کی اگر افادیت تھی تو بس اتنی کہ اتوار کے اتوار لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ خواجہ صاحب کے حلقہ

بگوشش تھے جنھیں مشاعروں میں چمکتا ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں خواجہ محمد شفیع دلی اور بیرونی دلی کے مشاعروں کی روح و رواں تھے۔ رعب دار شخصیت، پاٹدار آواز ۔۔۔ دلی کی ٹکسالی زبان ۔۔۔ اور شاعر کے تعارت کرانے کا دلچسپ انداز اس سلسلے میں خواجہ صاحب رعایت لفظی کے بادشاہ تھے۔

اس وقت دلی کے مشاعرے بھی خواجہ صاحب کی محفل، اور ان کی شخصیت کے رنگ کے ہوتے تھے۔ مشاعرہ لوٹنے والے شعراء میں نخشب، شکیل، صابر دہلوی، فیض جھنجھانوی اور ظریف دہلوی وغیرہ تھے۔ حفیظ، مجاز، جذبی، فیض، میراجی اور ان کے ہم مشرب شعرا دلی کے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اور ان بھاری بھرکم ادبی شخصیتوں کی دلی میں موجودگی کے باوجود دلی کی عام مجلسی زندگی ان سے محروم تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات اک تذبذب اور ذہنی جمود کے شکار تھے۔ شاید انگریزی سرکار کی کشمکش برداشت کرنا ان کے ادبی مزاج کے خلاف تھا۔ مگر زندگی کی ضروریات ، اور گوناگوں تقاضوں نے انھیں سرکاری دفتروں اور محکموں کے آستانوں پر کھڑا کر دیا تھا ۔۔۔ پطرس اور چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر دلی ہی میں تھے۔ مگر خاموش ۔۔۔ مختار صدیقی نے "ذہن منقبرے" کے عنوان سے ان حضرات کے ادبی سکوت پر ایک مضمون لکھا تھا جو ساقی میں چھپ کر بہت مقبول ہوا تھا ۔۔۔

فیض احمد فیض کی نقش فریادی، چھپ کر مقبول ہو چکی تھی۔ مگر اب وہ بقول مجاز عزت کرنل تھے۔ خود فیض نے غالبًا اپریل ۴۵ء میں عربک کالج ہال میں اقبال ڈے کے موقع پر اقبال کی شاعری کے تجزیہ پہلو پر تقریر کرتے ہوئے اپنے بارے میں کہا تھا "میں کبھی شاعر تھا" جذبی، رسالہ آج کل

کے نائب مدیر تھے۔ بہت پیے دیئے رہتے تھے۔ نہ کسی سے ملنا نہ جلنا ـــــ "فروزاں" کی نظموں کے بعد ان کا تازہ کلام دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی ایک نظم "موت" سنایا کرتے تھے ـــــ مجاز زندہ تو تھے مگر اپنی شکست کی آواز بنتے جا رہے تھے۔ ان کی نظم "اعتراف" اسی زمانے کی ہے ۔ ے

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

اور وہ دونوں نظمیں ۔ ے

الٰہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلی کا شرابی آگیا ہے ـــــ " اور ے

آنکھوں میں بس رہے ہیں حسینانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ ـــــ اور ے

بول اری او دھرتی بول ـــ راج سنگھاسن ڈانواڈول

مگر مجاز کی ان نظموں میں نہ "آوارہ"۔ اور "رات اور ریل" جیسا آہنگ ہے اور "خوابِ سحر" جیسی تازگی اور وسیع النظری۔ مگر ابھی مجاز میں بھرپور زندگی گذارنے کی تڑپ باقی تھی۔ وہ ہارڈنگ لائبریری (موجودہ ہردیال پبلک لائبریری) کے کاؤنٹر پر بیٹھتے تھے اور کہا کرتے تھے۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک وسیع قبرستان میں ہوں۔ اور ان الماریوں میں مردے سجے ہوئے ہیں۔ کہیں سے شیکسپیئر جھانک رہا ہے کہیں سے غالب۔ کہیں ملٹن ـــــ کہیں میر ـــــ لائبریری میں شامیں گذارنا واقعی مجاز کی زندگی کا المیہ تھا۔ یہ وہی مجاز تھے جنھوں نے کبھی اپنے ایک بد مذاق دوست سے کہا تھا ے

ہو نہیں سکتا تری اس بد مذاقی کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں کتاب
رکھ بھی دے تو اس کتاب خشک کو بالائے طاق
اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق

اب مجاز کے لیے رنگ و بو کی بزم قریب قریب درہم برہم ہو چکی تھی۔ وہ چاندنی چوک میں اپنے ایک ایڈوکیٹ دوست کے ڈرائنگ روم میں رہتے تھے۔ لکشمی ریسٹوراں کے سامنے۔ ان کے مکان کے نیچے ایک پنواڑی کی دوکان تھی جس سے وہ اکثر کٹھرے کی بوتل لیا کیا کرتے تھے۔ مجھے اکثر مجاز کے ساتھ لکشمی ریسٹوراں اور میجسٹک سینما کے اوپر میخانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر مجاز نے مجھے کبھی پینے کی ترغیب نہیں دی ہیں) بر ذوق مجاز کے ساتھ بھی خالص سوڈا پیتا تھا۔۔ ایک چیز جو میں نے مجاز سے سیکھی وہ ہے فن کے بارے میں خلوص۔۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اگر عشق بھی کرتا ہوں تو شاعری کے لیے۔۔ مجاز کو اس بات کا بھی بڑا خیال رہتا تھا کہ ان کی تازہ نظم و غزل کے بارے میں مختلف ادبی حلقوں میں کیا رائے قائم کی جاتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی تخلیق روایت پرستوں، ترقی پسندوں اور جدید ادب کے پرستاروں۔ سب کے معیار پر پوری اترے اور وہ اپنی اس کوشش میں یقیناً کامیاب تھے۔

مجاز کے علاوہ دلی میں دوسری مسحور کن شخصیت تھی نہال سیوہاروی کی نہال سب ادیبوں سے زیادہ مفلوک الحال تھے۔ لیکن سب سے زیادہ رجائیت پسند۔ وہ ریلوے اکاؤنٹس میں کلرک تھے۔ میں نے انھیں کبھی افسردہ نہیں دیکھا۔ کبھی ان کے کلام میں

قنوطیت کی جھلک نظر نہیں آئی۔ کبھی ان کے تخلیقی سوتوں پر خشک ہونے کا گمان نہیں گذرا ہے

دہر ہے عرصۂ ستم اہلِ ستم سے جنگ کر

اپنی اس نظم پر وہ عامل تھے اور آدمی کی عظمت کے قائل۔ وہ مصائب کی آندھیوں کے سامنے انسان کو کوہِ گراں سمجھتے تھے۔ رجائیت ان کی شاعری کا مزاج بن چکی تھی ہے

ابھی امیدِ وفا نہ توڑو، سیاستِ دلبری نہ چھوڑو
ابھی کہاں ناامید ہوں میں ابھی مجھے اعتبار سا ہے

وہ ہمیشہ اپنے عالم میں کھوئے ہوئے نظر آئے اور یہ عالم ان کے چہرے، آواز اور لباس۔ سب سے ظاہر ہوتا تھا ہے

نہال کو پے پئے ہے مستی ہے مفت الزامِ مے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

مگر وہ زاہدِ خشک نہیں تھے پہلی بار وہی مجھے مجازؔ سے ملانے ان کے مکان پر لے گئے تھے۔ وہ رات بھی عجیب رات تھی۔ ۳۱، دسمبر ۱۹۴۴ء کی رات ــــ مجازؔ نے ساغرؔ نظامی اور بیگم ذکیہ ساغر نظامی کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ساغرؔ پونا سے چند روز کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ساغرؔ اور بیگم ساغرؔ کے علاوہ اس دعوت میں جذبیؔ شریک تھے اور نہال سیوہاروی جو مجھے اپنے ساتھ ان لوگوں سے ملانے کے لیے لے گئے تھے۔ ساغرؔ، مجازؔ اور جذبیؔ سے یہ میری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ اس رات کا تاثر میری ایک نظم زندگی میں موجود ہے۔ ہے

کس طرح کہہ دوں کہ دنیا مرکزِ آلام ہے

تہاں شباب و انقلاب کے شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام اسی نام سے مشہور بک ڈپو، فراش خانہ سے شائع ہوا تھا۔ نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن پر انھیں کمال عبور حاصل تھا۔ اور بڑی خود اعتمادی تھی۔ وہ گھٹیا آدمی سے کبھی نہیں ملتے تھے معمولی شعر پر کبھی داد نہیں دیتے تھے۔ اہل علم ان کی عزت کرتے تھے۔ حضرت سائل دہلوی کے شاگرد تھے۔ مگر استاد کے رنگ سے ہٹ کر شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام 'ساقی' میں باقاعدگی سے چھپتا تھا۔ کثیر الاولاد تھے مگر غمِ ذات سے بے نیاز اپنے حال پر قانع صبح کو بلا ناغہ دیوانِ حافظ اور کلامِ نظیری کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

ان دنوں میراجی کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ مکتبۂ ساقی سے ان کے کلام کے مجموعے چھپے تھے۔ ساقی میں وہ 'باتیں' پابندی سے لکھتے تھے جو اکثر لوگوں کو ان کی نظموں سے زیادہ پسند آتی تھیں۔ مگر وہ کبھی کسی محفل یا مشاعرہ میں نہیں جاتے تھے۔ گویا دلی والوں کے نزدیک وہ اب بھی لاہور ہی میں رہ رہے تھے۔

ادھر ساقی کے پڑھنے والوں میں محمد حسن عسکری کے مضامین نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ ویسے عسکری بھی آدم بیزار تھے۔ ان سے صحیح ملاقات ساقی کے صفحوں پر ہی ہوتی تھی۔ خورشید الاسلام 'آج کل' چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی دلی آتے تھے تو عطا محمد شعلہ کے کمرہ پر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنا شبلی والا مضمون ہمیں وہیں سنایا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک خوبصورت نظم سرکتے ہے لکھی تھی۔ یہ وہی نظم ہے جو تقریباً بیس سال بعد آل انڈیا ریڈیو

سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں اس سال کی اُردو کی بہترین نظم کی حیثیت سے ۱۴ قومی زبانوں کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ خورشید اس زمانے میں بھی کبھی اچھے شاعر نظر آتے تھے اور کبھی اچھے نقاد ——— اور آج بھی وہ اسی روش پر قائم ہیں۔

اختر الایمان جولائی ۱۹۴۳ء میں دہلی سے تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ جا چکے تھے۔ مگر دہلی کا نوجوان اور پڑھا لکھا طبقہ ان کی شاعری اور شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام "گرداب" مکتبۂ ساقی سے تازہ تازہ چھپا تھا جس میں میرا جی اور مختار صدیقی کا مشترکہ دیباچہ شامل تھا اور خاصے کی چیز تھا ——— میں بھی نگینہ سے دہلی اختر الایمان کے لیے ایک جذبۂ عقیدت لے کر آیا تھا۔ اختر سے میری ملاقات جون ۱۹۴۲ء میں نگینہ میں ہی ہوئی تھی جہاں وہ آل انڈیا انصار کانفرنس کے عظیم الشان اجلاس میں ایک نوجوان لیڈر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اور انھوں نے انصاریوں اور غیر انصاری کے مابین تنازعوں پر ایک بصیرت افروز تقریر کی تھی۔ اور ہندوستان میں اس طرح کی اونچ نیچ، طبقاتی کشمکش اور جذبۂ نفرت کو ہندوستان کی غلامی اور انگریز کی سیاست کا نتیجہ قرار دیا تھا جبکہ اس اجلاس میں عبد القیوم انصاری جیسے نیشنلسٹ لیڈر نے اپنی شعلہ بیانی کو انصاریوں اور غیر انصاریوں کے درمیان نفرت کی خلیج کو بڑھانے اور اس کشمکش کی آگ کو اور بھڑکانے کے لیے صرف کیا تھا۔ اس تقریر کا زہر دور کرنے کے لیے صدر کانفرنس نے بطور خاص اختر الایمان سے تقریر کرنے کو کہا تھا ——— اس اجلاس میں اختر الایمان کی شرکت یوں بھی اہمیت رکھتی تھی کہ اختر الایمان کا وطن نگینہ کے قریب ہی ایک قصبہ جلال آباد ہے اور ایک

انصاری کی حیثیت سے ہی نہیں۔ بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے اپنے ضلع کی نمائندگی بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ دبلے پتلے گہرے سانولے رنگ کے اختر الایمان آل انڈیا انصار کانفرنس کے ہیرو بن گئے تھے اور ان کی نظمیں نقش پا۔ اور محلکے ــــ اسی اجلاس میں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک نظم اختر نے ترنم سے پڑھی تھی ـــ دہلی میں نوجوانوں کا ایک معقول طبقہ ان کی شاعری اور شخصیت کا گرویدہ تھا۔ اگرچہ اب اختر الایمان دہلی میں کبھی کبھار ایک مہمان کی حیثیت سے ہی آتے تھے۔ مگر ادبی حلقوں میں ان کا چرچا تھا۔ خاص طور پر عربک کالج کے ہونہار طالب علموں کا حلقہ ـــ جمیل الدین عالی ارشد مختار۔ عباس عباسی۔ ملک نسیم الظفر، نعیم پرویز، رضی الدین اطہر حسن اور حسن عسکری (قلمی نام ابن سعید) یہ سب اختر ایمان کی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے اس گروپ سے میری دوستی کچھ ایسی ہو گئی جیسے ہم لوگ بہت پرانے ساتھی ہوں ـــ جمیل الدین عالی اس زمانہ میں بھی پختہ غزل کہتے تھے اور بڑی پرسوز آواز میں شعر پڑھتے تھے مشاعروں میں بھی مقبول تھے۔ ٥

کوئی زحمتِ مکرر نہ اٹھے نگارِ خنداں
بڑی دقتوں میں سدھرے ہیں مزاجِ غم پسنداں
وہ نہ جانے کس ادا سے کوئی وعدہ کر گئے تھے
کہ تڑپ رہے ہیں اب تک مرے اشکِ نیم خنداں

مگر عالی کا وہ جوہر ابھی سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا جو پاکستان جا کر کھلا۔ وہ ایک خوش باش خوبصورت اور لاابالی نوجوان تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک دن پاکستان رائٹرز گلڈ جیسے ادارے کے

روح رواں بن جائیں گے ــــ اطہر ہماری محفلوں کے خاموش ساتھی تھے۔ رضی ہمیشہ خشک موضوعات پر گفتگو کرتے۔ نعیم پرویز نیم ادیب تھے۔ مگر ماہنامہ "انصاری" کے مدیر تھے اور انھوں نے نہایت خوبصورت پرچے ایڈٹ کئے۔ مگر بس تین چار، نعیم تعلیم کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے تھے۔ پھر پاکستان اور بھری جوانی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ملک نسیم الظفر کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ وہ ملک حبیب کے صاحبزادے اور ملک حبیب کے بھائی تھے۔ ایک عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ اور چند سال پہلے انتقال کر گئے۔ عباس عباسی بڑی خوبصورت غزلیں کہتے تھے۔ مگر کبھی کبھی۔ مشاعروں سے انھیں سروکار نہ تھا۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

اس گروپ میں سب سے زیادہ ذہین تھے ارشد مختار، جدید رنگ کی نظمیں کہتے تھے۔ کچھ نظمیں نیرنگ خیال میں چھپی تھیں۔

ہم سب دہلی کی ادبی فضا اور بے ہنگم مشاعرہ بازی کے بے حد شاکی تھے۔ آخر ارشد مختار کی تجویز پر ایک انجمن "غالب اکیڈمی" کے نام سے قائم کی گئی جس کے ہم سب لوگ بنیادی ممبر تھے۔ اس کے کئی جلسے کوچہ چیلان میں ارشد مختار کے مکان پر ہوئے جن میں ہم سب لوگوں نے اپنی اپنی چیزیں پڑھیں اور ایک دوسرے پر کھل کر تنقید کی جس کا اس وقت دہلی میں رواج نہیں تھا۔ ملک نسیم الظفر کا افسانوی مضمون "جھل مل" غالب اکیڈمی کی یادگار رہے ــــ ارشد مختار کی نظم زندگی جس میں اس نے زندگی کے بارے میں تار مولا بنا کر سوچنے والوں پر خوبصورت طنز کیا تھا۔ ے

چائے پیتے ہوئے خاموش ہو کچھ بات کریں

زندگی کیا ہے ذرا غور کریں

زندگی مہل کی چمنی کے سوا کچھ بھی نہیں

کہ جہاں آ کے بکا کرتا ہے مزدوروں کا گوشت

زندگی اجڑا ہوا گاؤں ہے، پگڈنڈی ہے

تالاب بھی ہے

میری چائے میں بہت ڈال دی ہے تو نے شکر

ارشد مختار نے اختر الایمان کی شاعری کے ابتدائی دور پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم تھا غالب پر بھی ایک دلچسپ مقالہ مکالماتی انداز میں لکھا تھا جس میں غالب پر کئے گئے اعتراضات کا جواب غالب کے اشعار سے ہی دیا گیا تھا

مگر یہ اکیڈمی زیادہ دن نہ چل سکی۔ ارشد اگر زندہ رہتے تو ایک اچھے شاعر اور بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے اردو ادب میں نام پیدا کرتے۔ مگر عمر نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں یورپ گئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد کسی ہوائی حادثہ کا شکار ہو گئے۔

غالب اکیڈمی کی طرح ممکن ہے چھوٹے پیمانے پر دہلی یا نئی دہلی میں ایسی ادبی انجمنیں ہوں جن میں شرکت کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ مثلاً ایک ادبی حلقے کا ذکر شاہد احمد دہلوی نے اپنے فیض والے مضمون میں کیا ہے۔ یہ مخصوص حلقہ نئی دہلی میں پطرس کی سرپرستی میں قائم کیا گیا تھا ___ مگر بڑے پیمانے پر کوئی ایسی انجمن نہیں

فیض کی طرف اشارہ، میری ایک نظم۔ اختر الایمان کی نظم، مخمور جالندھری کی نظم

تھی۔ جہاں ہر شخص شریک ہو سکے۔ اور ادب کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہو۔ دہلی کی زندگی کی وضع داری تنقید کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔

دہلی کی ادبی فضا میں اس وقت ایک ہلچل مچ گئی جب ٹاؤن ہال میں ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے درمیان بڑے پیمانے پر ایک مناظرہ ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے اور سردیوں کے موسم کی یہ گرما گرمی مجھے اب تک یاد ہے ــــ اس وقت دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کوئی شاخ قائم تھی نہ حلقۂ اربابِ ذوق کی یہاں تو خواجہ محمد شفیع کا طوطی بولتا تھا۔

وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے

جب ماہر القادری اور راجہ محمود آباد وغیرہ نے بمبئی میں ترقی پسندوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کی گونج دہلی تک بھی پہونچی اور سب سے پہلے خواجہ صاحب خم ٹھوک کے ترقی پسندوں کے سامنے آنے کو تیار ہوئے کہ یہ حق انھیں کو پہونچتا تھا۔ اس وقت تک ترقی پسندی کے نظریہ میں شدت نہیں آئی تھی۔ اور ادب میں محض جدیدیت کا پرچم بلند کرنے والوں کو بھی ترقی پسندوں میں ہی شمار کیا جاتا تھا۔ میرا جی ن۔ م۔ راشد ترقی پسندوں کی صف میں تھے اور حسن عسکری کے افسانے بھی 'نیا ادب' میں چھپتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے وہ خدوخال تو اکتوبر ۱۹۴۵ء کی حیدرآباد والی کانفرنس کے بعد ابھرنے شروع ہوئے جن کی وجہ سے بعد میں نئے ادیبوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہوا۔ اور تقسیم وطن اور سجاد ظہیر کے پاکستان چلے جانے کے بعد۔ بات بڑھتے بڑھتے سردار جعفری کے قائم کردہ 'دارورسن' تک پہونچی جس

پرچن چن کرادیبوں اور شاعروں کو لٹکایا گیا ـــــ خیر ـــــ یہ الگ موضوع ہے۔

دہلی میں بہت زور شور سے مناظرہ کی تیاریاں ہوئیں۔ ادھر سے سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور اختر الایمان، اور ادھر سے خواجہ محمد شفیع، مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ایڈیٹر برہان) اور سر سلطان احمد ــــ سر سلطان صدارت کر رہے تھے ــــ خواجہ محمد شفیع نے خطابت کا وہ زور دکھایا کہ ایک ایک فقرہ پر تالیاں بجیں وہ دلی والوں کے مزاج سے واقف تھے۔ نہایت جذباتی تقریر کی۔ جوش کی نظموں کے اقتباسات پیش کرکے فرمایا کہ ترقی پسندی کفر و الحاد کی تحریک ہے۔ میراجی کی نظم لب جوئبارے، اور دوسری نظمیں پڑھ کر اعلان کیا کہ ایسے مخرب الاخلاق ادب کے خلاف آواز اٹھانا میں اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔ راشد کی نظم "انتقام" کو انھوں نے اپنے مقاصد کے لیے خوب استعمال کیا۔

خواجہ محمد شفیع گرج رہے تھے اور دریا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر نے نہایت سنبھلے ہوئے اور پروقار لہجہ میں کہا کہ ترقی پسندی صرف یہی نہیں ہے جس کی مثالیں خواجہ صاحب نے پیش کیں ترقی پسندی اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمان ہے۔ انسان دوستی، وطن پرستی اور آزادی کے لیے جد وجہد ترقی پسندی کا مطمع نظر ہے۔ مگر یہ دلیلیں خواجہ صاحب کے جوشِ خطابت کے آگے ماند نظر آئیں اختر الایمان نے البتہ ایک اچھے ڈبیٹر کی طرح فراٹے دار تقریر کی اور جذباتی طور پر مجمع کو اپنے ساتھ بہالے جاتے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے مگر انھیں صاحب صدر بیچ بیچ میں ٹوکتے رہے ـــ اپنی تقریر میں اختر الایمان نے اشتراکیت کے نظریہ پر بولتے ہوئے کہا کہ اگر قیامت کے دن ایک کی جگہ

کے ستر نیکیاں ملیں گی تو آپ آخرت کی دولت کمانے کی خاطر اپنی پوری دولت غریب عوام میں ہی کیوں تقسیم نہیں کر دیتے ۔ اس پر بہت زور زور سے تالیاں بجیں ۔

مگر اس مناظرے کا دھواں دھار تقریروں کے علاوہ کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور دہلی کی ادبی فضا میں کوئی انقلاب نہیں آیا ۔ ہاں اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ خواجہ شفیع کی محفلوں سے جو ایک اکتاہٹ ہم نئے لکھنے والوں میں پیدا ہو رہی تھی وہ کچھ شدت اختیار کر گئی اور ہم لوگوں نے حلقہ ارباب ذوق کی طرز پر ایک نئی انجمن بنانے کا ارادہ کیا ۔ اس زمانے میں عطا محمد شعلہ نے نئی نئی مضمون نگاری شروع کی تھی ۔ غزل کے بارے میں عطا کا ایک مضمون "دنیا ادب" میں چھپ کر مقبول ہو چکا تھا ۔ "نئے نقاد" کے عنوان سے عطا نے اختر انصاری اور آل احمد سرور پر مضامین لکھے تھے ۔ ظاہر ہے ایسے مضامین کے پڑھنے کی جگہ خواجہ کی "اردو مجلس" نہیں تھی ۔ اور ہم لوگوں کی جدید نظمیں بھی اردو مجلس کی محفلوں میں لوگوں کے سر سے گذر جاتی تھیں ۔ عطا پٹودی ہاؤس دریا گنج میں اس مکان میں رہتے تھے جس میں علی گڑھ جانے سے پہلے اختر الایمان اور خورشید الاسلام رہتے تھے ۔ گویا اس کمرے کی فضا نئی شاعری اور نئی فکر کے لیے ساز گار تھی چنانچہ ہم لوگوں نے ایک انجمن بنا ڈالی اس کا نام حلقہ ارباب ذوق نہیں کچھ اور رکھا — غالباً بزم ادب — اس کی پہلی نشست میں محمد حسن عسکری مختار صدیقی ، تابش صدیقی ، ضمیر اظہر اور کئی اور ایسے ادیب آئے جو دہلی کی ادبی محفلوں میں کبھی شرکت نہیں کرتے تھے ۔ میرا جی اس نشست میں نہیں آسکے تھے ۔ مختار صدیقی نے اس نشست میں اپنی نظم "اناؤنسر" سنائی تھی ۔ میں نے "آخری جام" — زوردار

تنقیدی نشست ہوئی اور ہم لوگ اپنی انجمن کے اس پہلے کامیاب جلسے سے
خوش تھے ۔اب تک ہم ایک دوسرے سے یا تو فرداً فرداً ملتے تھے یا رسائل میں
ایک دوسرے کو پڑھتے تھے ۔اب نئی طرح سوچنے والوں اور لکھنے والوں
کو مل بیٹھنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ ملا ۔

اس انجمن کی کئی نشستیں ہوئیں ۔لیکن پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔کیونکہ
عطا محمد نائب تحصیلدار بن کر دہلی سے باہر چلے گئے اور مل بیٹھنے کی کوئی
معقول جگہ نہ رہی ،میرا بھی دہلی سے جی اچاٹ ہوگیا اور میں اپنی شوریدہ
سری کے ہاتھوں مجبور ہوکر اگست ۱۹۴۵ء میں بمبئی چلا گیا ۔پھر دلی ۔ اور دلی
کے ادبی ہنگامے ایک کہانی بن گئے ــــــ

بمبئی میں میری ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس
کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے ۔

ذوالفقار علی بخاری[1]

(سید ذوالفقار علی بخاری کا شمار آل انڈیا ریڈیو کے عظیم معماروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو (دہلی) میں ملازمت اختیار کی، دہلی، کلکتہ اور بمبئی ریڈیو اسٹیشنوں پر ڈائریکٹر کے عہدہ پہ فائز رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بی بی سی (لندن) سے منسلک رہے۔ تقسیم وطن کے وقت پاکستان چلے گئے اور ایک طویل عرصے تک وہاں کنٹرولر آف براڈکاسٹنگ رہے۔ چند سال پیشتر کراچی ہی میں انتقال کیا۔ مجھے ان کے ساتھ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں کام کرنے کا فخر حاصل رہا۔ یہ تاثراتی مضمون انہیں دنوں کی یادوں پر مشتمل ہے۔)

رفعت سروش

میں ان دنوں میونسپل کارپوریشن بمبئی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۴۵ء

---

[1] بخاری ولادت ۱۹۰۴ء وفات ۱۲ر جولائی ۱۹۷۵ء

کی ایک خوشگوار شام کی بات ہے کہ حبیب تنویر مجھے بخاری صاحب سے ملانے کے لیے اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے گئے۔ مجھے چوتھی منزل پر ویٹنگ روم میں بٹھا دیا اور خود رفو چکر۔ ذرا دیر میں ایک صاحب کے ساتھ آئے جنہیں دیکھ کر میں نے قیاس کیا کہ یہی بخاری صاحب ہوں گے۔ رسمی تعارف کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک بلند قامت، مردانہ وجاہت کا پیکر، خوش پوش جامہ زیب انسان، چہرے پر شرافت اور ذکاوت کے ساتھ شرارت کے آثار، گھنگھریالے خشک کھڑے ہوئے بالوں اور گھنی اور تنی ہوئی ابروؤں سے رعب ٹپکتا ہوا۔ پیشانی پر تفکر کی لہریں اور آنکھوں میں خوب سے خوب تر کی جستجو۔ مخاطب ہوئے تو محسوس ہوا کہ آواز احساسات کا صوتی پیکر ہے، اور لہجے میں سحر آمیز گھلاوٹ ہے تکلفی سے میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئے اور بے عنوان گفتگو شروع کر دی ــــ میں نے اس سے پہلے نہ بخاری صاحب کو دیکھا تھا نہ ان کی آواز سنی تھی۔ بس حبیب تنویر نے اتنا ذکر کیا تھا کہ "نیا ادب" (بمبئی) کے تازہ شمارے میں میری نظم "مداوا" ان کو پسند آئی تھی اور غالباً یہی نظم وجہ ملاقات بن گئی تھی۔ گفتگو شروع ہوئی تو ادب و شعر کی منزلوں سے گزرتی ہوئی ذاتی زندگی تک آ گئی۔ عصمت اور منٹو کی افسانہ نگاری زیر بحث رہی، جوشؔ، ن۔ م۔ راشد اور جدید شاعری پر بے تکان گفتگو ہوئی۔ "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" غالباً ان کو میری یہ بات پسند آئی کہ مجھے جوشؔ کی شاعری زیادہ پسند نہ تھی جس میں لفظوں کی بازی گری زیادہ ہے اور خیالات کم۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے یک لخت پوچھا۔

"شراب پیتے ہو؟"

"نہیں۔"

"سگریٹ؟"

"نہیں"

"کہاں رہتے ہو؟"

"بڑے بھائی کے ساتھ"

"کیا خرچ ہوگا؟"

"اندازاً سو روپے۔"

"ریڈیو پر نوکری کروگے؟"

"جی ہاں۔"

"تو کل سے آجاؤ!"

میں ان کی طلسماتی شخصیت سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ انکار کی جرأت تو درکنار یہ سوچنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی کہ نوکری چھوڑنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں میں نے اپنی پرانی ملازمت کو جس کی مدت ایک ڈیڑھ ماہ سے زائد نہ تھی) ذہن سے ایسا محو کر دیا کہ استعفیٰ تک نہ دیا۔۔۔ اور اگلے دن سے ہی ریڈیو اسٹیشن جانے لگا۔

نہ کوئی درخواست نہ باقاعدہ انٹرویو۔۔۔ مجھے آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ہندوستانی سیکشن میں ۱۰۰ روپے ماہوار پر کام کرنے کا کنٹریکٹ دے دیا گیا جہاں حبیب تنویر مجھ سے ایک مہینے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور یکم اپریل ۱۹۴۶ء کو یہ کنٹریکٹ ۱۷۰ روپے ماہوار کے اسٹاف آرٹسٹ کنٹریکٹ میں تبدیل ہو گیا۔ ۔۔۔ لیکن اس وقت نہ مجھے ۱۰۰ یا ۱۷۰ کی پرواہ تھی نہ کنٹریکٹ کے تفصیلات کی (اگر مجھے اس وقت اسٹاف آرٹسٹ کی حقیقت معلوم ہوتی تو شاید میں اپنی باقاعدہ ملازمت چھوڑ کر اس چکر میں نہ پڑتا) میں تو زندگی کے شدید تجرباتی دور سے گزر رہا تھا اور بخاری صاحب سے ملاقات بھی ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

پھر ریڈیو کا جادو ــــ چنانچہ میں بے دریغ اس کوچے میں داخل ہو گیا اور ایسا کھویا کہ آج تک اس بھول بھلیاں میں گم ہوں۔

ڈیٹنگ روم والے خوش گفتار اور خوش مذاق بخاری صاحب نے جب مجھے اپنے دفتر کے کمرے میں بلایا تو خدا کی پناہ ــــ! میز پر بیٹھے ہوئے اس قوی ہیکل اور فولادی پیکر بخاری کو دیکھ کر بخار سا آنے لگا۔ یہ ان کا افسرانہ روپ تھا اور بحیثیت افسر کے وہ اپنے قریبی سے قریبی دوست اور عزیز کی بھی رعایت نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کی افسرانہ ادا عجیب تھی کہ جن لوگوں کو زیادہ عزیز رکھتے تھے ان سے زیادہ اور سخت کام لیتے تھے اور سرزنش کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے ان کی شخصیت کا یہی وہ پہلو تھا جس نے ان کو بہترین فنکار کے ساتھ بہترین منتظم بھی بنا دیا تھا۔ اسٹاف کے سب لوگ ان کے رشتۂ محبت میں بھی گرفتار تھے اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں بھی سرشار تھے۔ یہ سرشاری اور اپنے کام سے والہانہ رغبت اسٹیشن ڈائریکٹر سے لے کر چپراسی تک میں موجود تھی۔

بخاری صاحب محض احکامات صادر کرنے والے اسٹیشن ڈائریکٹر نہیں تھے بلکہ وہ ہر سطح کے کام میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے، اور ہر شخص کے جوہر ذاتی کو پہچان کر اسے جلا دینے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر کے سامنے میری کیا بساط ــ محض ایک اسٹاف آرٹسٹ اور وہ بھی اس زمانے کا اسٹاف آرٹسٹ جب صرف ایک سال کا خشک کنٹریکٹ ہوا کرتا تھا اور اسٹیشن ڈائریکٹر کی ہاں یا نہیں پر نوکری کا دارومدار ہوتا تھا۔ مگر مجھ جیسے بے بضاعت انسان کی ذہنی تشکیل میں بھی انھوں نے ذاتی دلچسپی لی۔ مجھے خود اسٹوڈیو لے گئے اور مائک پر بولنا سکھایا۔ قلم پکڑ کر ریڈیو کے لیے لکھنا سکھایا ــ پروگراموں کی ترتیب اور پروڈکشن کے رموز سے واقف کرایا اور چند ماہ کے اندر اندر اس قدر کام سے لاد دیا کہ

صبح سے لے کر رات تک سر کھجانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ اناؤنسر ڈرامہ آرٹسٹ اسکرپٹ رائیٹر پروڈیوسر۔ سب کچھ رفعت سروش۔ لیکن ہر لمحہ اور ہر مرحلے پر بخاری صاحب کی شفقت میسر۔ یہ شفقت اور ہمت افزائی ہی تھی کہ جو کام کرتے پر اکساتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو یہ ہمت افزائی نازبرداری کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ خود ڈرامہ کی ریہرسل کرا رہے ہیں۔ آرٹسٹوں نے کہا بخاری صاحب اب تو بھوک لگنے لگی۔ انھوں نے ڈرامے کی پوری کاسٹ کو لنچ کرایا اور پھر ریہرسل شروع۔ اب ایسے نازبردار پروڈیوسر سے کون کترائے گا۔

ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ نشریات میں زندگی برقرار رہے۔ چنانچہ مروجہ اصولوں کی شکست و ریخت کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ان دنوں پروگرام پہلے سے ریکارڈ نہ ہوتے تھے۔ براہِ راست نشر ہوتے تھے۔ بچوں کا پروگرام ہو رہا ہے۔ آپ اچانک اسٹوڈیو میں آ دھمکے اور بمبئی خاں بن کر پروگرام میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اپنے فلیٹ پر (جو اسٹوڈیو سے ملحق تھا) موسیقی کا کوئی نشریہ پروگرام سن رہے ہیں۔ موڈ آیا تو سیدھے اسٹوڈیو پہنچ گئے اور گانے والے کو داد دینی شروع کر دی۔ سیدھے سادھے پروگرام کو محفل موسیقی کا رنگ دے دیا۔ جی میں آیا تو بیچ بیچ میں خود اناؤنسمنٹ کرنے لگے۔

اپنے اسٹاف سے تعلقِ خاطر کا یہ عالم تھا کہ کسی کا کان گرم ہو جائے بخاری صاحب عیادت کو موجود۔ ایچ۔ آر۔ شاہ (مرحوم) ان دنوں پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ انھیں پاگل پن کا دورہ پڑا۔ وہ کھار رہتے تھے جو اس وقت بمبئی کا مضافاتی علاقہ تھا اور ریڈیو اسٹیشن سے کافی فاصلے پر تھا۔ پروگرام اسسٹنٹ اور اسٹیشن ڈائرکٹر میں کئی مدارج کا فرق ہے مگر بخاری صاحب

اس فرق کو روا نہ رکھتے تھے۔ حبیب تنویر اور شبیر صاحب کو اپنی کار میں بٹھا کر شاہ صاحب کی عیادت کو جاتے۔ ان کو اقبال کی غزل " دو پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن " اپنے مخصوص ترنم میں سناتے۔ یہ غزل سنتے سنتے شاہ صاحب پر رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی اور پھر جی ہلکا ہو جاتا۔ یہ معمول کئی ہفتے تک جاری رہا۔

بخاری صاحب سے ہم لوگوں نے علم نشریات ہی نہیں علم مجلسی بھی سیکھا دفتر کے بعد شام کو ان کے فلیٹ پر محفل آرائی ہوتی اور محفلیں رات گئے تک چلتیں مجھے اکثر ان محفلوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔ بخاری صاحب کی ظرافتِ طبع کے جوہر یہیں کھلتے اور ان کی حاضر جوابی، حافظے اور متنوع مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا موسیقی ہو یا شاعری، مذہب ہو یا فلسفہ، فلم ہو یا سیاست ہر موضوع پر ماہرانہ گفتگو کرتے اور مخاطب پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ البتہ شکار سے انہیں کوئی رغبت نہ تھی۔ کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو جانور مارنے کا وحشیانہ شوق کیوں ہوتا ہے۔

بخاری صاحب کو ادبیات سے گہری دلچسپی تھی اور ان کے اس ذوق کو ان کے بڑے بھائی پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حفیظ اور فیض جیسے لوگوں کی صحبت نے جلا بخشی۔ وہ ادب میں ترقی پسند تحریک " کے حامی نہیں تھے مگر نظریات سے قطع نظر بہت سے ترقی پسند ادیبوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے جوش، بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) اور سردار جعفری کو اکثر اپنے یہاں بلاتے اور گھنٹوں محفل جمتی۔ ادب نوازی ان کے مزاج کا ایک حصہ تھی مگر ادیبوں کے ساتھ سلوک ہوتے تھے تو اس طرح نہیں کہ ان پر احسان کر رہے ہوں انہیں خاطر احباب کا ہمیشہ خیال رہتا تھا کہ نازک آبگینوں کو

ٹھیس نہ لگ جائے ـــ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری کے بے حد مداح تھے۔ وہ بمبئی آئے تو مہینوں ان کو اپنے گھر مہمان رکھا اور محض ان کی خاطر ان کے لڑکے آغا جان کو اناؤنسر رکھا۔ بہزاد لکھنوی کے صاحبزادے انور بہزاد کو بطور اناؤنسر بمبئی اسٹیشن پر ملازم رکھنے کی بھی یہی وجہ تھی ـــ اور بھی مختلف ادیبوں اور شاعروں کو خوش اسلوبی کے ساتھ نوازتے رہتے تھے ـــ سردار جعفری کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور ڈاکٹروں نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت سردار ُوقف پارٹی تھے۔ اور درم و دام ان کے پاس کہاں۔ چنانچہ بخاری صاحب کی ہدایت پر میں نے سردار کی بارہ تقریریں ایک ہفتے میں ریکارڈ کیں جن کے نشر ہونے کی نوبت بہت بعد میں آئی۔

بخاری صاحب نہایت زودگو اور قادر الکلام شاعر تھے مگر اپنا کلام چھپوانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے اپنی غزلوں کے مسودے مجھے دے دیا کرتے تھے کہ ان کو صاف کرکے لکھ دو (کچھ غزلوں کے مسودے آج تک میرے پاس محفوظ ہیں) میں نے ایک غزل ان کی اجازت کے بغیر ہفتہ وار "نظام" کے ایڈیٹر قدوس صہبائی کو دے دی۔ جب وہ غزل چھپ گئی تو سمجھ گئے کہ میری شرارت ہے بلایا اور کافی دیر تک گرم و سرد لہجے میں یہ سمجھاتے رہے کہ میں تفریحِ طبع کے لیے شعر کہہ لیتا ہوں مگر ان اشعار کو قابلِ اشاعت نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ ان کی کسرِ نفسی تھی ورنہ وہ بہت اچھے شاعر تھے ؎

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے!
اک صدا ہے جس پر ہم رقص کرتے رہتے ہیں
وجد میں جو آئے زیر و بم کو کیا جانے

زینت کی ودیعت عشق، عشق کی عنایت غم
غم کی ہزار نعمت ہے کوئی غم کو کیا جانے
چھاؤں کی صورت ڈھلتے ڈھلتے
رہ جائیں گے چلتے چلتے!
بخاری کو برا کہنا برا معلوم ہوتا ہے
اسے ہم جمعِ احباب میں شامل سمجھتے ہیں

فی البدیہہ شعر کہنے کا بہت شوق تھا کبھی کبھی دفتر کے کام سے اوب جاتے تو شعرگوئی سے دل بہلاتے ایک روز میں اپنی میز پر جھکا ہوا کچھ کام کر رہا تھا کہ بخاری صاحب میز پر آکر بیٹھ گئے اور مجھے احتراماً بھی کرسی سے نہ اٹھنے دیا کہنے لگے ـــ کوئی مصرعہ دو ـــ اور قافیے بولتے جاؤ ـ میں نے ایک مشکل مصرعہ دیا۔ ردیف تھی "اینٹ" اور قافیہ "سخن" ۔ فوراً بولے۔

کوئی ہے جوش کوئی ہے ساغر کوئی مجاز
سیدھی نہیں ہے ایک بھی بزمِ سخن کی اینٹ

اور یوں شعر لکھانے چلے گئے جیسے املا بول رہے ہوں اسی طرح انھوں نے کئی ڈرامے لکھائے۔ مگر اب ان کے مسودے نایاب ہیں۔

اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ذوالفقار علی بخاری جیسے شخص کی تحریروں سے اس کا دامن تقریباً خالی ہے تقسیم وطن کے بعد پاکستان جاکر انھوں نے کبھی کبھار کچھ غزلیں چھپوائیں، مگر ایسے قلم کار کی زیادہ سے زیادہ تحریروں کو محفوظ کیا جانا چاہیے تھا۔ جس کی بات بات میں ایک بات ہوتی تھی۔ بس ان کی ایک نادر تحریر ہے "سرگزشت" جس میں ان کی ریڈیو کی زندگی کی کچھ جھلکیاں اور

یادیں ہیں۔ یہ سرگزشت ان کے ان سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو قسط وار حریت (کراچی) میں شائع ہوئے۔ تقریباً ۵۰۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب ایک اخبار کے کالموں کے لیے روا روی میں لکھے ہوئے یہ مضامین علم و ادب، فن موسیقی، طنز و مزاح، فکر و فلسفہ، اخلاقیات اور نشریات کے بارے میں ان کے اچھوتے خیالات اور سیکڑوں ہندوستانی اور غیر ملکی تاریخی شخصیتوں کی قلمی تصویروں کا خوبصورت گلدستہ ہیں تو اگر وہ جم کر لکھتے تو اردو ادب کے سرمائے میں کتنا وقیع اضافہ ہوتا۔

بخاری صاحب سے آخری ملاقات انڈو پاک اردو کانفرنس کے موقعہ پر دہلی میں ہوئی۔ یہ غالباً سنہ۱۹۵۸ء کی بات ہے وگیان بھون کا عظیم الشان ہال ہندو پاک کے ادیبوں اور دانشوروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اس کے روح و رواں تھے ——— افتتاحیہ جلسے کے خاتمے پر دونوں ملکوں کے دانشور ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ عید کا سا سماں تھا۔ میری آنکھیں اس بھیڑ میں بخاری صاحب کو تلاش کر رہی تھیں ——— وہ دور سے ہی نظر آگئے ——— وہی یگانۂ روزگار شخصیت ——— مگر بالوں پر سفیدی اور چہرے پر کچھ جھریاں چھا گئی تھیں ——— میں ادب سے ان کی طرف بڑھا ——— ایک نظر رک کر دیکھا مجھے ——— (بارہ سال بعد دیکھ رہے تھے) پھر بلساختہ بولے ——— "رفعت! یو لک ینگر" (تم کم عمر نظر آرہے ہو) اور یہ کہتے ہوئے مجھے باہوں میں سمیٹ لیا ——— کتنی شفقت کتنا پیار ان کی وہ گرمجوشی مجھے آج تک یاد ہے ——— اپنی کتاب "سرگذشت" میں بھی انھوں نے میرا ذکر جگہ جگہ کیا ہے۔

انھوں نے ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو میں بڑے دھماکے کے ساتھ

قدم رکھا۔ دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی اسٹیشنوں کے ڈائریکٹر رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بی بی سی سے منسلک رہے۔ تقسیم وطن کے بعد بخاری صاحب پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ مگر ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کو کوئی سیاسی لکیر تقسیم نہیں کر سکی جن لوگوں کے دلوں پر بخاری صاحب کی سحر انگیز شخصیت اور فنی عظمت کا نقش تھا وہ وقت کے ساتھ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ ہند و پاک کی نشریات کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن چکے ہیں۔ اور آل انڈیا ریڈیو کے ایک عظیم معمار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے ؎

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

میرا دوست — مجازؔ[1]

چوک میں ایک تانگہ کھڑا تھا۔ ایک چھریرے بدن کے نوجوان نے نہایت متانت کے ساتھ تانگہ والے سے پوچھا "حضرت گنج جاؤ گے؟"

"جی ہاں، جاؤں گا۔" تانگہ والے نے اپنے گھوڑے کی باگیں سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تو جاؤ"۔ نوجوان نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ تانگہ والا نوجوان کا منہ تکتا رہ گیا۔ اور فضا میں مسکراہٹیں بکھر گئیں۔

یہ نوجوان تھا مجازؔ۔ اسرار الحق مجازؔ، اردو کا مایۂ ناز شاعر، سنجیدہ ظرافت اور بذلہ سنجی مجازؔ کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ مجازؔ کے نام کے ساتھ بہت سے لطیفے منسوب ہیں۔ مگر مجازؔ ایسے لطیفہ گو نہیں تھے جو ہر محفل میں بے تکے لطیفے سنا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں ان کے جملوں اور فقروں میں ایسی بے ساختگی ہوتی تھی جو لوگوں کو لاجواب کر دیتی تھی۔ وہ کم بولتے

---

[1] مجازؔ۔ ولادت ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء وفات ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء

تھے مگر برمحل ؎

• اس کی تھی بات بات میں اک بات۔

مجازؔ سے میری ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی اس وقت ہندوستان میں ان کی نظموں کی دھوم تھی۔ ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے ایک ادبی جلسہ میں تخشبؔ جارچوی نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ ایک دبلا شخص، اونچی لمبی ناک لمبے لمبے ہاتھ، تیز چمکتی ہوئی آنکھیں چھوٹا سا دہانہ، لمبے لمبے بال، کھدر کے براؤن کالر دار کرتے اور علی گڑھ کٹ کے لٹھے کے پاجامہ میں ملبوس۔ تخشبؔ نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ مجازؔ ہیں"۔ اور مجھے بیساختہ مجازؔ کی مشہور نظم یاد آگئی ؎

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ان دنوں مجازؔ ہارڈنگ لائبریری میں کاؤنٹر کلرک تھے، اور لائبریری میں کتابیں پڑھنے والوں کو کتابیں دینا ان کے فرائض میں شامل تھا، مگر خود انہیں کتابوں سے کوئی شغف نہ تھا طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک "کتاب کے کیڑے" دوست سے کہا تھا ؎

"ہو نہیں سکتا نزی اس بد مذاقی کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب"

اور اب ہارڈنگ لائبریری میں شام کے وقت لوگوں کے ہاتھوں میں کتابیں دیکھ کر مجازؔ کڑھتے تھے۔ لائبریری کے بارے میں ایک دن کہنے لگے

یہ قبرستان ہے۔ ان الماریوں میں مردے سجے ہوئے ہیں۔ ایک الماری سے شیکسپیئر جھانک رہا ہے۔ دوسری الماری سے ملٹن۔ ایک کونے میں خیام ہے۔ ایک گوشے میں غالب اور ـــــ" مجاز کو لائبریری میں بڑی گھٹن ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجاز نے ہارڈنگ لائبریری کی یہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اور دلّی میں ناشاد و ناکارہ پھرا نے تھے۔ اس دور میں ان کے اکثر دوست ان سے کترانے لگے تھے۔ مجاز کسی کے گھر جاتے تو بعض لوگ اندر سے ہی کہلا دیتے کہ گھر میں نہیں ہیں۔

وہ اپنے ایک وکیل دوست شاید (جمیل الرحمٰن) کے ڈرائنگ روم میں چاندنی چوک میں رہتے تھے، لکشمی ریسٹورنٹ کے سامنے۔

اسی مکان کے نیچے ایک پنواڑی کی دوکان سے کھڑا ادھار لیتے اور جب پیسے جیب میں ہوتے تو لکشمی ریسٹورنٹ یا میجسٹک سینما کے اوپر والے بار میں شغل کرتے۔ ان مقامات پر مجھے اکثر ان کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہیں صرف سوڈا پیا کرتا تھا۔

مجاز کو رات کو دیر تک جاگنے کی عادت تھی۔ مگر علی الصبح اٹھ جاتے۔ ان دنوں اکثر صبح صبح میرے کمرہ پر جو گلی خان خاناں، اردو بازار میں واقع تھا، آجایا کرتے تھے اور ہم دونوں مٹیا محل کی ایک دکان پر ملائی دار دودھ ناشتہ میں پیتے تھے۔ میری دودھ پینے کی عادت پر کبھی کبھی مسکرا کر کہتے: "تم اب تک شیرخوار ہو" لیکن انہوں نے مجھے کبھی شراب پینے کی ترغیب نہیں دی۔ یہ مجاز کے کردار کی عظمت کی دلیل ہے۔

وہ بہت شریف النفس انسان تھے۔ شاعر تھے۔ ہزاروں کے محبوب شاعر مگر بے راہ روی اور عیاشی کو کبھی انہوں نے اپنا مسلک نہیں بنایا۔ دیارِ عشق میں ان کا حال "یوسف" جیسا تھا ایک زمانہ تھا کہ ان کے گرد زلیخاؤں کا

ہجوم رہتا تھا۔ اور ایک زہرہ جمال زلیخا کے دامِ حسن میں وہ اسیر بھی ہو گئے تھے
اس عشق کی جھلکیاں ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتی ہیں ؎

"میری وارفتگیٔ شوق مسلّم لیکن
کسکی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لیے"

اس عشق نے بقول غالب مجاز کو نکما کر دیا تھا ورنہ اس حادثہ سے پہلے وہ آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" کے ایڈیٹر تھے اور شاعرِ محض اور ناشاد و ناکارہ نہیں تھے۔

میں جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں یعنی ۱۹۵۳ء کا، عام خیال یہ ہے کہ مجاز ان دنوں عشق کی وادیٔ پُرخار سے نکل چکے تھے اور "زلفِ زلیخا" کے اسیر نہیں رہے تھے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے ؎

"جس نے برباد کیا، مائلِ فریاد کیا
وہ محبت ابھی اس دل میں جواں ہے ساقی"

اپنی قیام گاہ سے رات کو گیارہ بارہ بجے وہ ٹیلی فون پر تجدید ملاقات کیا کرتے تھے کئی بار اس یوسف نے میری موجودگی میں اپنی زلیخا سے فون پر باتیں کیں۔

شراب کی طرح عورت کے معاملہ میں بھی ان کا نقطۂ نظر نہایت صحت مندانہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں کنواری لڑکیوں کو ورغلانے کے حق میں نہیں ہوں۔ کسی پاکدامن کو داغدار کرنا ایسا جرم ہے جس کا تعلق فرد سے نہیں بلکہ سماج سے ہے۔

اپنے فن کے بارے میں بیحد سنجیدہ تھے۔ ایک بار مجھ سے کہا "میں اگر شراب پیتا ہوں تو شاعری کے لیے عشق کرتا ہوں تو شاعری کے لیے۔ دراصل

میری محبوبہ میری شاعری ہے۔ جب کوئی نئی نظم یا غزل کہتا ہوں تو اس امر پر غور و خوض کرتا ہوں کہ مختلف ادبی گروہوں پر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ اور مجموعی حیثیت سے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔

اور غالباً مجازؔ کی یہی احتیاط پسندی تھی کہ ان کی شاعری نے قدیم و جدید ترقی پسند، رجعت پرست۔ ہر طبقہ سے داد و تحسین حاصل کی۔ وہ عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول تھے اور آج جدید ترین نسل بھی انہیں دلچسپی سے پڑھتی ہے مجازؔ نے اپنی ہی نسل کے شعرا کو اساتذہ کی طرح متاثر کیا۔ یہ کیا اہم کارنامہ نہیں ہے! نئی نسل پر انہیں بڑا بھروسہ تھا۔ میں نے اس دور میں مجازؔ کے علاوہ کوئی شاعر ایسا نہیں دیکھا جو بالفعل نئے لوگوں کی اس طرح ہمت افزائی کرے۔

"جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر"

مجازؔ میری بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ تم میری دریافت ہو۔ ترقی پسند نظریات کی طرف مائل مجھے مجازؔ ہی نے کیا۔ جب میں ۱۹۴۵ء میں دہلی سے بمبئی گیا تو مجھے سردار جعفری کے نام ایک زوردار تعارفی خط دیا۔ دہلی سے چلتے وقت مجازؔ نے مجھے اپنا ایک براؤن کھدر کا کرتا بھی دیا تھا جو میں نے بہت دنوں تک بمبئی میں پہنا۔ جیب میں ڈائری اور پنسل رکھنے کی عادت بھی میں نے مجازؔ ہی سے سیکھی۔

مجازؔ کو نہ سستی شہرت کی چاہ تھی نہ جاہ و مرتبہ و دولت کی ہوس اس لیے وہ اپنی رائے کا بیباک اظہار کرتے تھے۔ اقبال کی بوجھل شاعری کے بارے میں یہ مصرعہ مجازؔ ہی نے کہا تھا ؎

"ندی گہری سہی، ٹھہری ہوئی ہے"

جب حفیظ جالندھری کو خان بہادر کا خطاب ملا اور فیض احمد فیض کرنل کے عہدہ پر فائز ہوئے تو ریڈیو کے مشاعرہ میں مجاز نے پطرس بخاری کے منع کرنے کے باوجود یہ مقطع پڑھ ہی دیا ے

"شاعر ہوں اور شاعر رنگیں نوا مجاز
کرنل نہیں ہوں، خان بہادر نہیں ہوں میں"

ہاں مجاز شاعر تھے۔ زمانہ ساز نہیں تھے۔ اس لیے زمانہ انہیں کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اور وہ گردش پہ یکڈ اوُن کے شکار ہوکر رانچی کے پاگل خانہ تک پہونچے۔

دہلی کے بعد مجاز کچھ عرصہ بمبئی بھی رہے۔ مگر بمبئی کی تیز رو زندگی مجاز کو بالکل راس نہیں آئی۔ بمبئی میں وہ اکثر چپ چپ رہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب فرقہ وارانہ فساد کی آگ بمبئی میں پھیلی تو مجاز کمیونسٹ پارٹی آفس (گول پیٹھا) میں رہتے تھے۔ پارٹی آفس کے نیچے جب یکے بعد دیگرے کئی انسانوں کی لاشوں کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھا تو اس روح فرسا منظر کی تاب نہ لاکر وہ بیہوش ہو گئے اور تین دن تک ان کے حواس بجا نہ ہوئے۔ یہ وہی شاعر تھا جس نے اپنے عنفوان شباب میں انقلاب کے آتشیں نغمے گائے تھے اور آزادی سے پہلے ایک خونیں انقلاب کی بشارت ان الفاظ میں دی تھی ے

پرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجدوں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں،
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

سُرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرق پر رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب"

جو شاعر تصور کے سہارے خونیں انقلاب کی اس قدر مکمل تصویر کھینچ سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں حقیقی منظرِ خونیں کو ایک لمحہ بھی دیکھنے کی متحمل نہ ہو سکیں اور وہ حواس باختہ ہو گیا۔

وقت کے ساتھ مجاز کی شاعرانہ صلاحیتیں کم ہوتی چلی گئیں۔ اور تخلیقی سوتے خشک ہونے لگے۔

ایک زہر تھا جو آہستہ آہستہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ شراب کی صورت میں یہ زہر پیکرِ مجاز مسکراتا تھا۔ اس نظام پر طنز کرتا تھا اس سماج پر ہنستا تھا مگر اب اس کا دماغ اشعار نہیں، لطیفے ڈھالتا تھا۔ اس کی چٹخارہ دار بیباک باتیں اور تیکھے لطیفے سننے کے لیے لوگ اسے شراب پلاتے تھے اور وہ دیوانہ وار یہ زہر پیتا تھا۔

اور ایک دن اس نے کل کائنات پر طنز کیا ایسا لطیفہ کہا جو نوکِ خنجر کی طرح اس کے دوستوں (اس کا دشمن کوئی نہ تھا) کے دل میں اتر گیا۔

وہ ۵، دسمبر ۱۹۵۵ء کی سرد چاندنی رات تھی جب لکھنؤ کے ایک شراب خانہ کی چھت پر مجاز نے موت کا قہقہہ لگایا۔ اور بڑا ہے

ہنسنے کے مجازؔ کے اس آخری لطیفہ پر دنیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
— مگر مجازؔ اب بھی مسکرا رہا تھا ؎

"اِس محفلِ کیف و مستی میں اِس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے"

—

نہالؔ سیوہاروی

یادش بخیر جب اُردو بازار۔ اُردو بازار تھا۔ اب نہ وہاں شاہد احمد دہلوی ہیں نہ ساقی بکڈپو اور نہ مکتبۂ علم و ادب، نہ آغا سرخوش قزلباش، نہ چمنستانؔ، نہ مولوی سمیع اللہؔ نہ منشی عبدالقدیرؔ اور اُردو بازار کے قریب ہی مٹیا محل میں نہ خواجہ محمد شفیع ہیں نہ ان کی اُردو مجلس کی ہفتہ وار بزم آرائیاں اور اُردو بازار کے ادھر پٹودی ہاؤس میں نہ اختر الایمان اور خورشید الاسلام ہیں۔ نہ عطا محمد شعلہؔ اور نہالؔ سیوہاروی۔ دلی میں یہ محفلیں نہ جانے کب سے آراستہ ہوں گی مگر میں جب ۱۹۴۳ء میں دلی آیا اور اُردو بازار کی ایک گلی خانخانان میں مقیم ہوا تو یہ محفلیں شباب پر تھیں۔ کچھ ادارے تھے اور کچھ ایسے اشخاص تھے جو اپنی ذات سے انجمن تھے۔ مکتبہ علم و ادب گویا شاہد کی بزم تھی اور ساقی گروپ کے علاوہ وہاں اغیار کا گزر نہیں ہوتا تھا یہاں کے مخصوص لوگوں میں تابش دہلوی، حسن عسکری، جمیل امروہوی

حبیب اشعر وغیرہ چمنستان میں مشاعرے کے شاعروں کا جمگھٹ رہتا تھا جیسے شکیل بدایونی، نخشب جارچوی، صابر دہلوی وغیرہ اور مولوی سمیع اللہ کے مکتبہ عزیزیہ کی لکڑی کی بنچوں پر ہر میل کا ادیب وشاعر مل جاتا تھا ــــــ کیونکہ یہ خانقاہ ہر مسافر کے لیے تقریباً ساری رات کھلی رہتی تھی۔ یہاں دلی کے بیرونی علاقوں اور بازار سے دُور رہنے والے ادیب شاعر بھی "ثواب حاصل کرنے کے لیے" آجاتے تھے چاہے جذبی ہوں یا مجاز، راز مرادآبادی ہوں یا میراجی، راشد ہوں، یا فیض ــــــ دوسری جنگ عظیم کے دفتروں نے پھیلا دُنے یوپی اور پنجاب کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو دلی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ ان ادیبوں اور شاعروں میں گروہ بندیاں بھی تھیں اور معاصرانہ چشمکیں بھی۔ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جائز وناجائز کوششیں بھی کی جاتی تھیں ــــ مگر اس ہجوم میں ــــ ایک شاعر تھا جو سب کو پسند تھا، سب کو عزیز تھا، سب کا پیارا تھا، سب کا محترم تھا، سب کا دوست تھا۔ اور کوئی اس کا دشمن نہ تھا۔ اور وہ پیارا شاعر، پیارا انسان تھا نہال سیوہاروی۔ ہر محفل میں اس کی خاطر خواہ عزت ہوتی تھی۔ ہر بزم اسے اپنا سمجھتی تھی، ہر بزرگ شاعر اس کو پیار کرتا تھا۔ اور اُسے دادِ سخن دیتا تھا اور ہر جدید اور نوجوان شاعر اسے اپنا ہم عصر کہنا اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا تھا۔

نہال سیوہاروی کا ایک شعر تو مجھے بچپن سے یاد تھا ؎

ادب سے پاؤں کو رکھ اس زمیں پہ اے واعظ
یہ میکدہ ہے یہاں سر جھکائے جاتے ہیں

اور جب ذرا ہوش سنبھالا تو "ساقی" اور "مخشر خیال" میں نہال سیوہاروی کی بہت سی نظمیں پڑھیں۔ ان نظموں اور اشعار کی گونج ذہن میں تھی جو نہال کو

ایک نہایت با حوصلہ اور بلند ہمت شاعر کے روپ میں پیش کرتی تھیں۔

دہر بے عرصۂ ستم اہلِ ستم سے جنگ کر
لشکرِ غم سے منہ نہ موڑ، لشکرِ غم سے جنگ کر

ایک نفس کے ساتھ ہیں گرچہ ہزار انقلاب
ہمتِ آدمی تو دیکھ پھر بھی جواں ہے آدمی

مرے وطن کی زندگی کا جس کو کہئے عہدِ نو
وہ آرہا ہے نیزہ و سنان سے کھیلتا ہوا

ہے میرے عزم کو درکار تازہ بازی گاہ
زمیں سے کھیل چکا آسماں سے کھیل چکا

یہ اقبالؔ اور جوشؔ کا زمانہ تھا اور کم از کم مجھ جیسے نوجوانوں پر اس وقت اقبالؔ کے بھاری بھرکم اور جوشؔ کے پُر جلال لب و لہجہ کا اتنا اثر تھا کہ اس رنگ میں کہنے والے شعراء کے کلام پر نظر جم جاتی تھی اور اشعار ذہن نشین ہو جاتے تھے اس لیے نہالؔ سیوہاروی میرے پسندیدہ شاعروں میں تھے۔ اور تصور یہ تھا کہ ساغرؔ اور روشؔ کی طرح نہالؔ بھی اپنی پُر جوش نظمیں جوش و خروش سے سناتے ہوں گے اور ہمہ تن انقلاب ہوں گے۔ اس زمانے کے "انقلابی شاعروں" میں سے میں نے دہلی آنے سے پہلے صرف ساغرؔ اور روشؔ صدیقی کو ہی مشاعروں میں سنا تھا۔

مگر جب خواجہ محمد شفیعؔ کی "اُردو مجلس" میں نہالؔ سیوہاروی کو پہلی بار دیکھا اور ان کا کلام ان کی زبانی سُنا تو تصور کے محل مسمار ہو گئے۔ نہالؔ

نہایت ہی لجلجے سے آدمی تھے جسے نہ پکڑوں کا ہوش تھا نہ چلنے کا اور شعر تو ایسے پڑھے کہ آدھے الفاظ ان کے منہ کے اندر ہی گھوم کر رہ گئے اور آدھے محفل کے کانوں تک اُلجھے اُلجھے پہونچ سکے۔ مگر چونکہ محفل ان کا نام سنتے ہی ہمہ تن گوش ہو گئی تھی اس لیے ایک ایک لفظ نے ہزار ہزار معنی پیدا کیے اور ہزار ہزار داد ملی۔ مگر نہاںؔ داد سے بیگانہ، اپنے اشعار جلدی جلدی اُگل کر گویا محفل شعر میں اپنا اخلاقی فرض پورا کر کے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ان کی اس بے نیازی کا یہ اثر ہوا کہ میں ان کے نیازمندوں میں شامل ہو گیا اور دہلی کے وہ دو سال ایسے گزرے جب نہاںؔ صاحب سے روز تیسرے دن ملاقات ہوتی تھی اور ان کی وہی روش تھی۔

گزر دل ویرانہ کر جہاں سے کھیلتا ہوا
زمیں سے کھیلتا ہوا زماں سے کھیلتا ہوا

اقبالؔ اور جوشؔ کی طرح رجائیت کو انھوں نے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کیا تھا بلکہ وہ زندگی سے نبرد آزما تھے مسلسل ناساعد حالات سے جنگ کرتے رہے اور اپنے تجربات زندگی کے نچوڑ کو روح شعر بناتے رہے۔ اگر وہ اقبال کے اتباع کی غلامی سے نکل سکتے تو یقیناً اور بھی اچھا شعر کہتے۔ مگر اقبالؔ کی ساحری نے بہت سے آزاد ذہنوں کی نشو و نما روک دی اور برگد کے درخت کی طرح ان کی کتابی اور حکیمانہ شاعری کا گہرا سایہ بہت سے نئے پودوں کی موت ثابت ہوا ہے نہال کے حصہ میں یہ بدقسمتی آئی تھی کہ ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں جن میں شاعر نے کاوش کر کے رنگ اقبالؔ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے آج کھینچ اوقات نظر آتی ہیں ؎

قسمت دہر بے نقاب میرے مکاشفات میں
جلوہ نما ہیں لاکھ صبح ایک سیاہ رات میں

نوعِ بشر کا ارتقاء معنی ارتقائے دہر
نوعِ بشر کے واسطے نوعِ دگر ہے یہ جہاں

عشق کا درس محبت کا بیاں تازہ کریں
آؤ ہنگامۂ تسخیر جہاں تازہ کریں

ایسی غزلوں کے علاوہ اقبال کے پامال موضوعات پر نہال نے بہت سی نظمیں کہیں ظاہر ہے ان نظموں میں فکری گہرائی نہیں ہے جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے اس لیے آج ان کا مجموعۂ کلام پڑھتے وقت ان نظموں کے ورق الٹ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ان نظموں کے عنوانات سے ہی "اقبالیت" آشکارا ہے۔ مثلاً "ساقی نامہ" "ہمالہ" "دپروانہ" "خود سحر" "سروشِ غیب کا پیغام" "بانگِ رحیل" وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ تو نہال سیوہاروی کی شاعری کا ایک پہلو ہے۔ وہ داغ اسکول سے تعلق رکھتے تھے اور سائل دہلوی کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہونے سے پہلے باغ سنبھلی کے شاگرد تھے جو

"داغ کے باغ کا نہال ہوں میں۔"

اُردو ان کی اکتسابی زبان نہیں تھی۔ وہ اہلِ زبان تھے اور شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے دادا اخترؔ تخلص کرتے تھے اور استاد ذوقؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ضلع بجنور کے سیوہارہ جیسے مردم خیز قصبہ سے ان کا تعلق تھا اور اردو بول چال اور محاورہ ان کی گھٹی میں پڑا تھا اس لیے ان کے کلام میں جو روانی بیساختگی شستگی اور شائستگی ہے وہ انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے پھر غمِ ذات کی مدھم آنچ سے ان کے اشعار کا خمیر تیار ہوا ہے

اور لطف یہ ہے کہ اس کا احساس خود انہیں نہیں تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں "شباب
زانقلاب" (ان کی کتاب کا نام) کے ڈانڈے ملاتے رہے مگر اچھا شعر دانستہ
نہیں کہا جاتا شعر خود اپنی راہ پیدا کر لیتا ہے ؎

غم نہ کر شمع رات گزرے گی
جلتے بجھتے حیات گزرے گی
رازِ دل کہہ نہ صورتِ غنچہ!
سو زبانوں پہ بات گزرے گی

بہار کا روپ بھی نگا ہوں میں اک فریب بہار سا ہے
فلک کے تیور ہیں خشمگیں سے زمیں کے دل میں غبار سا ہے

مضرابِ الم سے تارِ نفس کو چھیڑتے ہیں ہم راتوں میں
آساں نہ کہو، آساں نہیں، الہام کے نغمے باتوں میں
اور داغ اسکول کی شوخی ملاحظہ ہو ؎

یوں آج سرِ رہ ٹھہرایا دیوانہ بن کے نہاں ان کو
محکم تھی گرفتِ دامن کچھ، کچھ دیر لگائی باتوں میں
اور وہی زبان کا چٹخارہ اور محاورہ بندی ؎

تیرے خیال میں ہر چیز سے اٹھایا ہاتھ
تیرے خیال سے میں ہاتھ اب اٹھاؤں کیا
یہ بھی کہتے ہیں کہ ہے عرضِ تمنا بے سود
یہ بھی کہتے ہیں کہ تیرے منہ میں زبان ہے تو سہی

لیکن اگر نہالؔ سیوہاروی کی شاعری داغؔ اسکول کے ہی دائرہ میں گھومتی رہتی تو وہ قابلِ ذکر شاعر نہ ہوتے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ داغؔ سے زبان دبیان لے کر "درد ِذفت اور زندگی کے تلخ وغیرہ میں حقائق کو شعر کے پیکر عطا کیے ہیں نظم اور غزل دونوں اصناف سخن میں مگر چونکہ وہ بنیادی طور پر (میرے نزدیک) غزل کے شاعر ہیں۔ اس لیے بہت سی مسلسل غزلوں کو نظموں کے خانے میں رکھ دیا ہے۔ یا پھر یا نیہ قسم کی نظمیں ہیں۔ جو میرے نزدیک قابلِ ذکر نہیں۔ ان کی نظم گوئی کی کوشش کے پیچھے دراصل وہ جابر وقت ہے جس نے فراقؔ گورکھپوری جیسے غزل کے شاعر سے نظمیں کہلا کر چھوڑیں اور نہالؔ سیوہاروی کی طرح فراقؔ گورکھپوری کے مجموعۂ کلام" روح کائنات" میں مسلسل غزلوں کو عنوانات دے کر نظموں کے انداز سے ہی شائع کیا گیا ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ جس جدید نظم کی داغ بیل سنگاپور کے آس پاس پڑی اس کی ہوا ابھی نہالؔ کو نہیں لگی تھی۔ اور یہ ٹھیک ہی تھا کیونکہ اپنے مزاج کی افتاد کے خلاف شاعری کرنے والے اور وقت کی موج میں بہنے والے شعرا ان سے پہلے گزرے ہیں جو لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔

نہالؔ سیوہاروی نے جو زندگی گزاری وہ ایک قلندر کی زندگی تھی وہ ایک کثیر الاولاد باپ تھے اور قلیل تنخواہ پانے والے ریلوے آڈٹ ڈپارٹمنٹ میں کلرک ۔ اس ماحول میں گھٹ گھٹ کے مر جانے کے بجائے انہوں نے دلاورانہ ہنستے ہوئے جینا سیکھ لیا تھا۔ زندگی کی تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ اور یہی وہ راز ہے جس نے ان کی شاعری کو رجائی لب و لہجہ دیا۔ ان کے اشعار میں رجائیت نعرہ ہونے کے طور پر نہیں ملے گی بلکہ ان کے دل کی آواز بن کر ابھری ہے۔

اس دل کے لیے کھیل ہے بارِ غمِ کونین
یہ مرحلۂ سخت بھی آساں نظر آیا
اُس درد کو ناز گا مرکی ہٹ کوئی دیکھے
جو درد کہ ناقابلِ درماں نظر آیا

برابر صدائے نفس آرہی ہے
رواں عمر کا کارواں دیکھتا ہوں

جہادِ زندگی میں دیکھ سخت کوشیاں میری
رواں دواں ہوں اپنے خاک دھول سے کھیلتا ہوا

روزِ ازل سے ہے یہ دوش پہ بارِ کائنات
ذرۂ ناتواں نہیں، کوہ گراں ہے آدمی

خم رہے کیوں سرِ غرورِ جلوۂ دہر کے حضور
اپنی تجلیوں سے آپ ایک جہان ہے آدمی

ابھی امید و فا نہ توڑو، سیاستِ دلبری نہ چھوڑو
ابھی کہاں نا امید ہوں میں ابھی مجھے اعتبار سا ہے

نہال سیوہاروی کی قلندرانہ شان ان کی نشست و برخاست اور کردار و گفتار سے عیاں تھی۔ وہ کبھی محض ملنے کے لیے اور مجلسی ضرورت کے تحت

جبرِ تہذیب کے طور پر کسی سے نہیں ملتے تھے۔ کسی کی بے جا تعریف نہیں کرتے تھے۔ اپنا شعر پڑھ کر داد کے طالب نہیں رہتے تھے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح ان کو بھی اپنی ناقدریٔ فن کا احساس تھا۔ اس کرب کا اظہار ان کے اشعار میں ہوا ہے مگر وہ شکوہ شکایت سے بلند تھے ؎

کیا یہ لازم ہے کسی کی انجمن کا رُخ کرے
دل کہ صدرنگِ تخیّل سے ہے خود اک انجمن

دماغ عرش پہ ہے میری بے نوائی کا
کسی کے قصرِ امارت پہ سر جھکاؤں کیا

ہم نے مانا کہ نہیں حاکی و فیروح نہاںؔ
پیرو دِ غالبِ اعجاز بیاں ہے تو سہی

مل ہی جائے گی زمانے سے کسی دن دادِ فکر
تنگ دل کیوں ہے نہاںؔ بخت آرا صبر کر

نہاںؔ کو اپنی قلندری اور رندی پر ناز تھا جو ہر بتداءً ان کے مزاج میں حل ہو چکے تھے ؎

وہ رند ہوں جسے رِندش خاص ہے پسند
مہنگی جو ہاتھ آئے تو سستی کو چھوڑ دوں

مگر ان کی رندی کا مطلب دیوانگی ہرگز نہیں تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے ماحول سے اور اپنے حالات سے جنگ کرتے رہتے اور مردِ میدان کی

طرح ان کے پاؤں جے رہے ؎

ہر چند ناگوار ہیں اوضاعِ اہلِ شہر
دیوانہ تو نہیں ہوں کہ بستی کو چھوڑ دوں

وہ بستی کی رونق تھے۔ دلی کی ادبی زندگی کے ہنگاموں اور اردو بازار کی شعری نشستوں میں ان کے بغیر گرمی نہ آتی تھی۔ ہم بہت سے لوگ گرمیوں کی شاموں میں اردو بازار کے پاس ایڈورڈ پارک میں گھاس کے قطعات پر بیٹھ جاتے اور شعر و شاعری کا دور چلتا۔ نہال صاحب ہم نوجوانوں کے مستقل ساتھی تھے۔ اپنے ہم عمروں کی بہ نسبت انہیں نوجوان نسل کے لوگوں سے مل کر زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور اس طرح گھل مل جاتے کہ عمر کے تفاوت کا احساس ختم ہو جاتا۔ مجھ سے پندرہ بیس سال بڑے ہوں گے۔ مگر اکثر محسوس ہوتا تھا کہ ہم عمر ہیں۔ بے تکلفی سے اپنا کلام سناتے مگر مشاعروں سے بہت بھاگتے تھے۔ مشاعرہ کرنے والے انھیں بلاتے تھے اور بڑے اشتیاق سے ان کا کلام سنتے تھے۔ مگر ان پر مشاعرہ میں جا کر عجیب بدحواسی طاری ہوتی تھی۔ ایک اناؤنسر نے پوری طرح تعارف بھی نہیں کرایا اور نہال صاحب مائک پر آ کر شعر پڑھنے بیٹھ گئے۔ زبان میں کچھ نقص تھا اس لیے الفاظ لڑ کھڑاتے ہوئے ادا ہوتے تھے۔

آج کل کبھی کبھی فرقت کاکوروی کو پڑھنا دیکھ کر نہال صاحب کی یاد آجاتی ہے مگر وہ ہمہ تن سنجیدگی تھے اور یہ سر بہ سر مزاح۔

پرائیویٹ صحبتوں میں نہال صاحب بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے اور ہمیشہ خوش مذاق لوگوں میں بیٹھتے تھے مجاز اور جذبی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مگر وہ پیتے نہیں تھے ہاں چکھ لیتے تھے۔ ؎

؎ یہ مضمون فرقت کاکوروی کی حیات میں لکھا گیا تھا

نہالؔ کو یے پینے سے مستی، ہے مفت الزامِ مے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار ہے

زمانہ بڑا ناقدر شناس ہے اور جو اپنا ڈھنڈورا خود نہیں پیٹتا۔ دنیا بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ نقادانِ فن و ادب بھی مصلحت کے تقاضوں کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ نہالؔ سیوہاروی جیسا شاعر پوری عمر نام و نمود سے بے نیاز رہا اس لیے بیشتر نقادوں نے بھی اس پر قلم اٹھانا ضروری نہیں سمجھا۔ آزادی سے پہلے ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ "گلبانگ آزادی" اور غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "شباب و انقلاب" چھپا تھا جس میں ۱۹۳۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ سن ۱۹۴۷ء میں یہ "قلندر" آخر اس بستی کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا اور وہاں چند سال اسی قلندرانہ اور درویشانہ شان سے جی کر ہمیشہ کے لیے ہماری نظر سے اٹھ گیا ؎

ہمیں ہے یاد سرگزشتِ زندگی نہالؔ کی
ہوا تمام حسنِ گلرخاں سے کھیلتا ہوا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نیا نیا بمبئی سے دہلی آیا تھا۔ کوئی بارہ سال پہلے وودھ بھارتی کے دفتر میں شرت اور میں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ان دنوں ان کی افسانہ نگاری شباب پر تھی اور ہندی افسانہ اکثر موضوع بحث رہتا تھا۔ راجندر یادو، موہن راکیش اور سریندر شرت اس وقت نوجوان ہندی افسانہ نگاروں کی صف اول میں تھے۔ کملیشور اتنے زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے ـــــ راجندر یادو سے تو میری ملاقات بہت پرانی تھی مگر راکیش سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

ایک دن ہمارے کمرے میں ایک کھلتے ہوئے ہنستے ہوئے چہرے اور مسکراتی ہوئی آنکھوں والا نوجوان داخل ہوا اور شرت نے بڑی گرمجوشی اور نہایت بے تکلفی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے راکیش سے میرا تعارف کرایا۔

موہن راکیش سے پہلی ہی ملاقات میں مجھے احساس ہوا کہ وہ نہایت ہشاش بشاش، خوش گفتار، سادہ مزاج، بے تکلف اور درویشانہ مزاج کا

مالک ہے درویشانہ اس لیے نہیں کہ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے ہوں اور تیاگ اور بیراگ کی باتیں کرتا ہو۔ بلکہ وہ جس کا مسلک یہ ہو کہ

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اور بعد کو جو ملاقاتیں راکیش سے ہوئیں اور اس کی جو زندگی سامنے آئی وہ اس شعر کی تفسیر ہی کہی جا سکتی ہے۔ اور آخر تک وہ اقبال کی اس کسوٹی پر پورا اترا کہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس نے اعلیٰ درجے کی شہرت پائی اچھی ملازمتیں حاصل کیں اور اعزازات حاصل کیے مگر اسی روش پر چل کر کہ

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

اس کا پورا نام مدن موہن گگلانی راکیش تھا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو سرزمین پنجاب میں پیدا ہوا۔ اور ۳ دسمبر ۱۹۷۲ء کو دہلی میں اپنے بے قرار دل کو قرار دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً ۴۸ سال کی زندگی میں اس نے وہ تمام منزلیں طے کر لیں جو ہندوستان کے فنکاروں اور مصنفوں کی قسمت ہوتی ہیں۔

فاقہ مستی، زندگی کی کشمکش اور ازدواجی زندگی کی الجھنیں۔ بحیثیت ادیب کے اعلیٰ درجہ کی شہرت اپنے وقت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت میں امتیازی شان۔ چاہے ریڈیو ہو، ٹیلی ویژن ہو، اسٹیج ہو یا فلم ہو۔ یا کتب و رسائل کی دنیا۔۔۔ راکیش نے ان سب پر دسترس حاصل

کی ٹائمز آف انڈیا کے ہندی کہانیوں کے ماہنامے "سارکا" کے وہ ایڈیٹر رہے۔
ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ان کی تخلیقات کو پیش کرنا اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔
اسٹیج کی دنیا میں تو انھوں نے نئے تجربات کیے اور جے شنکر پرساد کے بعد
ہندی اسٹیج کو نئی عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کیا۔ اور بہت سے ڈرامے
لکھے جن میں "آدھے ادھورے" ان کے فن ڈرامہ نگاری کی معراج ہے۔
اور اسی ڈرامے نے ان کی عظمت بحیثیت ڈرامہ نگار کے ملک کے بااقتدار
حلقوں میں بھی منوائی۔ ان کو سنگیت ناٹک اکیڈمی کا ایوارڈ ملا۔ اور اس
ڈرامے کو اوم شیو پوری نے فلمایا بھی ہے۔

ملک نے اس گوہر نایاب کے جوہر کو جلد ہی پہچان لیا۔ یہاں ملک
سے مراد ارباب حکومت سے ہے اور ملک کے عوام تو اس کو بہت پہلے اپنا
من پسند ادیب مان چکے تھے۔ اس کو نہرو فیلوشپ دی گئی اسے فلم سنسر بورڈ
کا ممبر بنایا گیا۔ اسے فلم فائننس کارپوریشن کی ڈائرکٹری کا اعزاز بخشا گیا۔

مگر ان سب اعزازات کو پانے کے لیے اس نے کسی کے در پر جبہ سائی
نہیں کی۔ اس نے وقت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے اس نے خوشامد نہیں کی۔ اور
اب ان منزلوں سے آگے ــــ بہت آگے چلا گیا ــــ اس کا اس طرح اٹھ جانا؛
گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میں وقت اور بندشوں سے آزاد ہوں۔

ہاں وہ بندشوں سے آزاد تھا۔ اور اس کا پورا کردار اس کا گواہ
ہے۔ وہ ایک قدامت پسند گھرانے کا پروردہ تھا۔ جہاں گوشت، لہسن
پیاز تک بھی کھانا منع تھا۔ مگر وہ ان بندشوں اور روڑھی واد پر ہنس کر
ان کو توڑنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی اور دلھن والے الٰہ آباد اسٹیشن پر بارات

کا استقبال کرنے پہنچے تو خود ہی اپنا رہبر تھا۔ بارات میں صرف موہن راکیش (معہ اپنے بستر اور سوٹ کیس کے) تھا اور لڑکی والے محو حیرت رہ گئے۔ لوگ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ذاتی زندگی میں روایتوں سے بندھے رہتے ہیں۔ راکیش جو کچھ کہتا تھا وہی کرتا تھا۔ اس نے روایتوں کے تمام بندھن توڑے اور جہیز اور بارات کے تکلفات میں نہ پھنسا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی وہ شادی کامیاب نہ ہوئی اور اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے کر اپنے لیے دوسری شریک حیات ڈھونڈلی۔

آزادہ روی کا ہی تقاضا تھا کہ وہ سرکار کی نوکری چھوڑ آیا۔ کیونکہ وہاں اسے کچھ خاص بندشوں میں جینا پڑتا تھا۔ ان خاص بندشوں کو کچھ ہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں پرائیویٹ اداروں میں ملازمت ـــــ چاہے وہ ایڈیٹری ہی کیوں نہ ہو ـــــ کرنے کا موقع ملا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موہن راکیش آج کے اینگری نوجوان کی طرح تھا ـــــ نہیں ـــــ وہ روایت کا احترام کرتا تھا۔ اس کے لباس نشست و برخاست اور تقریر وغیرہ ـــــ ہر بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خواہ مخواہ توڑ پھوڑ پسند نہیں۔ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے آپ کو تولنا اپنا شعار سمجھتا تھا اور اگر اس کی کوئی خوبی اسے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے تو یہی کہ وہ "فیشن ایبل جدید" نہیں تھا۔ اس نے روایت کے حسن کو سمجھا تھا۔ اسے اپنے افسانوں، ناول اور ڈراموں میں برتا۔ جہاں محسوس کیا روایت کو تیاگ کر توڑ دے کر اسے اور خوبصورت بنایا اور جب ضرورت محسوس ہوئی تو اسے توڑ بھی دیا۔ مگر اس طرح نہیں کہ کلا سے بجائے قلم کار کے جلاد کہا جائے۔

وہ ہندی ادب کی اس پرخلوص پیڑھی سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے دورِ غلامی میں آنکھیں کھولیں اور جن کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں "مقصدیت" رہی۔ اور اسی لئے مقصدیت اور معنویت کو وہ نت نئے تجربے کرنے کے باوجود نہیں چھوڑ سکے۔

ان کے فن کی اہم خصوصیت اس کا "ہندوستانی پن" ہے اور صاف ظاہر ہے کہ وہ مغربی اقدار سے نہ مرعوب تھے نہ ان کی نقالی کرتے تھے۔ اور آخر میں تو انھوں نے اپنا راستہ خود ہی بنالیا تھا۔ جو اب آنے والی نسلوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔

وہ ایک سچے قلم کار تھے اپنی دوسری بیوی کانتا سے انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میری زندگی میں پہلا نمبر میرے قلم کا ہے دوسرا نمبر ہے میرے دوستوں کا ——— اور تیسرا نمبر پر تم ہو سوچ لو نمبر ۳ بننا تمہیں منظور ہے یا نہیں اگر منظور ہے تو میرے دل کے دروازے کھلے ہیں ورنہ ......

اپنے فن اور قلم سے اتنی محبت آج کتنے لوگوں کے دلوں میں ہے وہ اپنی تحریر کو ذریعہ معاش نہیں ——— سادھنا سمجھتے تھے اب یہ الگ بات ہے کہ ان کی روٹی بھی اسی سادھنا میں لکھی تھی لیکن راکیش کو کبھی پیسے کا لالچ نہ تھا پیسے نہ ہونے تو چار مینار سگریٹ پی لی اور پیسے آگئے تو سگار پیا اور یاروں کو پلایا۔ وہ ہے ہمیشہ خوش یاروں کے یار ان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان کے احباب ان پر جان چھڑکتے تھے۔

ایک بار قرول باغ میں ایک غنڈے نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ مانا ہوا غنڈا تھا۔ ہر دسترس سے آزاد۔ دہلی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں مگر جب راکیش کے دوستوں کو معلوم ہوا تو فوراً ٹی ہاؤس میں ہنگامی میٹنگ ہوئی اور ادیبوں کا ایک وفد اس وقت کے وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری کے پاس پہنچا۔ وہ تو در اکیش کے فن کے قدر دانوں میں

سے تھے۔ فوراً کارروائی کی گئی اور وہ غنڈا جو اپنے آپ کو "ہر دسترس سے آزاد" سمجھتا تھا ـــــ اگلے ہی دن گرفتار کر لیا گیا۔

اگر موت موہن راکیش پر علی الاعلان حملہ کرتی تو شاید اس کے قدردان اور دوست اس سے بھی دست و گریباں ہو جاتے۔ مگر وہ بزدل چوروں کی طرح آئی اور بغیر مدافعت کا موقع دیئے اس کے دل میں گھس گئی اور راکیش کے پاس کوئی چارہ نہ رہا سوائے اسے گلے سے لگا لینے کے۔

راکیش کے فن کا سفر کہانی سے ناول اور ناول سے ڈرامہ کی طرف تھا۔ ڈرامے میں ان کو اپنی منزل صاف نظر آتی تھی اور ان کے فن کے جوہر ڈرامہ نگاری ہی میں کھلے۔ ان کے کردار جدید ہندوستان کے منقلب سماج کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اور "آدھے ادھورے" میں تو ہر چہرہ اور ہر تصور پوری اور بھرپور ہے۔

راکیش کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہاں اس کا بوجھ اس نوجوان نسل پر آ پڑا ہے جو اس کے کرداروں سے زندگی کی رمق حاصل کرتی تھی وہ بیتاب شعلہ تو بجھ گیا مگر اس کے ادھورے کام کو پورا کرنا نئی نسل کا کام ہے۔

حرفِ آرزو

(یادِ احتشام حسین[1])

دوسری جنگ عظیم کی آگ سرد ہو جانے کے بعد دنیا پھر اپنی شیرازہ بندی کرنے لگی۔ مظلوم اور کچلی ہوئی انسانیت کو طمانیت کا سانس لینے کا موقع ملا۔ علم و فن نے اپنے بچے کھچے خزانوں کو سنبھالنا شروع کیا۔ محاذِ جنگ پر ترقی پسند قوتوں نے فتح یاب ہونے کے بعد اب محاذِ امن پر اپنا فرض پورا کرنے کے لیے سرگرمی سے کام کرنا شروع کیا۔ ہندوستان میں بھی ترقی پسند مصنفین نے سر جوڑ کر مل بیٹھے اور مسائلِ حیات کو سمجھنے کا بیڑا اٹھایا اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد (دکن) میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی تاریخی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا — اس کانفرنس میں غیر منقسم ہندوستان کے گوشے سے نمائندہ ترقی پسندوں نے شرکت کی۔ میں بمبئی سے حیدرآباد اس کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا۔ یہیں میری ملاقات پروفیسر سید احتشام حسین سے ہوئی اور ایک گہرا نقش دل پر چھوڑ گئی۔

---

[1] احتشام حسین ولادت ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء وفات یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

اٹھائیس سال ہوگئے، مگر مجھے کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ احتشام حسین صاحب جن کے تنقیدی مضامین میں ان سے ملنے سے پہلے پڑھ چکا تھا نہایت متانت اور سنجیدگی سے حسین اور جچے تلے انداز میں، مختصر اور محتاط الفاظ میں۔ اپنی رائے کا اظہار کرتے وہ اس وقت بھی اپنی طبعی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور تجربہ کار نظر آتے تھے جو بات بھلائے نہیں بھولتی وہ ان کا نہایت غیر جذباتی لہجہ ہے۔ ورنہ جلسوں اور کانفرنسوں میں لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں دھواں دھار باتیں کرتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ عام لوگ ان سے نالاں ہو کر ان کی اچھی یا بری بات کو کان دھر کر سنتے ہی نہیں۔ احتشام صاحب اس طرح کے نمود و نمائش سے بے نیاز تھے۔ اس لیے ان کی بات کو مخصوص توجہ سے سنا جاتا — ہم لوگ حیدرآباد میں آٹھ دن ساتھ رہے اور ان دنوں میں کسی وقت بھی احتشام صاحب کو لاابالی انداز میں نہ پایا۔ دراصل یہ سنجیدگی ان کی زندگی کا جزو تھی، ان کی تحریر کی روح تھی اور ان کے فن کی اساس تھی۔

پھر ایک بار۔ غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں احتشام صاحب بمبئی آئے تو ان کو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا سنجیدگی ان پر پوری طرح سایہ فگن تھی۔ اور وہ ایک بزرگ انسان معلوم ہونے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک اندرونی خلفشار کا شکار ہو چلی تھی اور ترقی پسند ادیب اور شاعر تشکیک و بے اعتمادی کے شکار تھے بڑے بڑے ترقی پسند ستون ہلنے لگے تھے۔ احتشام صاحب آئے اور ہماری انجمن کی نشست میں انھوں نے جس روایتی سنجیدگی اور احتیاط سے اہم اور متنازعہ موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس نے ہم سب کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

اور پھر ان سے دہلی میں ملاقاتیں ہوئیں اور انھیں اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ احتشام صاحب فکرِ سخن بھی کرتے ہیں۔

[1] یہ مضمون ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا۔

تو دل یہ ماننے کو تیار نہ ہوا کہ اس قدر غیر جذباتی اور کبھی کھل کر دو ٹوک باتیں نہ کرنے والا سخن شناس سخن ور کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر ان کی تہ دار شخصیت نے یہ بھی کر دکھایا اور وہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے جانے لگے۔

میری ان سے آخری ملاقات ایک مشاعرے میں ہوئی۔ میں تو خیر مشاعروں کے معاملے میں آوارہ گرد ہوں مگر احتشام صاحب جون کے مہینے میں الٰہ آباد سے مئو ناتھ بھنجن جیسے دور افتادہ قصبہ میں مشاعرہ پڑھنے گئے۔ وہ میرا پہلا اتفاق تھا احتشام صاحب کو سننے کا — یوں تو ہمارے کئی نقّاد غالباً منہ کا مزا بدلنے کے لیے شعر کہتے ہیں — مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین یا آل احمد سرور، لیکن احتشام صاحب کا شغف دیکھیے کہ اس قدر دور مشاعرہ پڑھنے جا رہے ہیں اور پُر مشاعرہ دل کش ترنم سے غزل سرا ہیں —!

مئو ناتھ بھنجن سے میں احتشام صاحب کے ساتھ ہی لوٹا۔ اور ان کے ہمراہ موٹر کار میں گنگا کے کھادر کی ریت پھانکتا ہوا الٰہ آباد تک آیا — اُفوہ — الاماں، کس قیامت کی گرمی تھی۔ بھر دوپہر میں ہم لوگ الٰہ آباد پہونچے اور دوپہر احتشام صاحب کے مکان پر گذری — صرف چند گھنٹے ان قیمتی لمحوں میں مجھے احتشام صاحب کی زندگی کی جو جھلک نظر آئی وہ ناقابلِ فراموش ہے اور قابل تقلید — احتشام صاحب کے پائے کا نقاد — احتشام کے درجہ کا عالم اور پروفیسر — اس قدر سادگی سے رہ سکتا ہے۔ یہ مجھے یاد کرتے ہیں تامل ہوتا اگر میں خود احتشام صاحب کو ان کے گھر پر نہ دیکھ لیتا۔ کیوں کہ میں بلند مرتبت ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کی زندگی اور ان کے تعیش سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ کس طرح غریبی کا پروپگنڈا کرنے والے اور غریبوں، مزدوروں اور مظلوموں کی ہمدردی میں قلم گھسیٹنے والے — دونوں ہاتھوں سے روپیہ

بٹورتے ہیں اور دو رنگی زندگی گذارتے ہیں۔ مگر احتشام صاحب کی زندگی ایک سادہ اور سچے انسان کی زندگی تھی اور نہ ان کے قول وفعل میں تضاد تھا نہ ان کے خیالات اور معیار زندگی میں ان کی ذات میں میں نے قناعت کی جو جھلک دیکھی وہ قابل رشک تھی، وہ اپنے مزاج سے ایک مرد قلندر تھے۔ اور اس لیے انھوں نے غیر کے آگے جھکنا اور اہل ہوس اور اہل اقتدار سے موقع پرستوں کی طرح معاملہ کرنا کبھی گوارا نہ کیا۔ ان کا طریق امیری نہیں فقری تھا۔ اور اسی لیے کبھی اپنی خودی کو نہ بیچا اور غریبی میں نام پیدا کیا۔

یہ احتشام صاحب کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی عمر نہ تھی۔ ابھی تو وہ اردو اور ہندوستان کی عوامی زندگی کے بہتر مستقبل کی جد وجہد کی خاطر جوان تھے۔ ان کی تحریریں ان کے اشعار اور ان کی باتیں غمازی کرتی تھیں کہ ابھی ان کے سینے میں بہت سے خزانے موجود ہیں جو اس کائنات کی امانت ہیں مگر وہ اس امانت کو اپنے سینے میں چھپائے اچانک ہم سے رخصت ہو گئے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ان کے فکر وفن کی منزل تو ایک تھی۔ انسانیت کی بقا کی منزل مگر اس تک پہونچنے کے لیے ان کا سفر کئی راہوں پر جاری تھا۔ ایک طرف وہ درس وتدریس کے ذریعہ نئے ذہن تیار کر رہے تھے تو دوسری طرف انھوں نے ادبی تنقید کو "مارکسی مشعل" سے روشن تر کیا اور تنقید کو تخلیقی فن کی بلندی تک پہنچایا۔ اور اس فن کو وہ غیر جانبدار اور متوازن لب ولہجہ دیا جو ان سے پہلے ناپید تھا۔ پھر ان کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر" اور ان سب پر مستزاد ان کا ذوق شعر گوئی ۔۔۔ کئی راہوں پر ان کے نقش قدم ملتے ہیں ۔۔۔ :

ان کا ضبط و تحمل بے مثال ہے۔ ادبی اور نظریاتی موضوعات پر اپنے حریفوں سے نہایت دوستانہ انداز میں اختلاف کرنا اور حق پر اصرار کرنا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ ان کی اس خوبی کا اس وقت سب سے زیادہ مظاہرہ ہوا جب ترقی پسند اور جدید ادب کی بحثیں شروع ہوئیں۔ وہ روایت اور فیشن کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے علم اور مطالعہ کی بنا پر مارکسی نقاد تھے اس لیے ان کے خیالات مستعار نہیں تھے۔ ان کی باتیں بے وزن نہیں تھیں اور اسی لیے انھیں جھلانے کی ضرورت کبھی نہیں محسوس ہوئی۔

وہ شور و شغب کے عادی نہیں تھے چنانچہ زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کسی ہنگامہ خیز بیماری کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ دنیا نے اچانک ہی سنا کہ احتشام صاحب موت کی آغوش میں چلے گئے ـــــ مگر موت ان کو اپنے شکنجے میں نہیں رکھ سکی ـــ ان کے جسم پر اس کا جادو ضرور چل گیا ـــ لیکن کیا محض وہ جسم ہی احتشام حسین تھا ـــ؟ ـــ نہیں احتشام حسین کا مطلب ہے ـــ حرفِ عمل ـــ اور یہ حرف ـــ حرفِ آرزو بن کر آج بھی زندہ ہے ـــ ہمارے اور آپ کے سینوں میں ـــ دنیا بھر کے انسانوں کے دلوں میں ـــ ●●

وہ ۱۹۴۳ء کے آغاز موسمِ سرما کی خوشگوار شام تھی۔ جب پتلی قبر (دہلی) پر ایک مشاعرے میں شکیل بدایونی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ علی گڈھ یونیورسٹی کے روایتی لباس میں تھے۔ بہت خندہ پیشانی سے ملے اور پھر ان سے دوسرے تیسرے دن ملاقات ہونے لگی کبھی خواجہ محمد شفیع کی اردو مجلس کی نشست میں کبھی اردو بازار میں مولانا سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ پر اور کبھی آغا سرخوش قزلباش کے کتب خانے اور چمنستان کے دفتر میں۔ ان دنوں دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کی دوڑ جامع مسجد تک تھی۔ اکثر ادیب کسی نہ کسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اور شام کو جامع مسجد اور اردو بازار اکثر آتے تھے۔ شکیل سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ اور اپنی عام فہم عشقیہ شاعری اور پرکشش ترنم کی وجہ سے شاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ہر وقت مسکراتے رہنا ہر شخص کو یہ احساس دلانا کہ وہ ان کے

---

[1] شکیل ولادت ۳ر اگست ۱۹۱۶ء وفات ۲۰ر اپریل ۱۹۷۰ء

Scanned by CamScanner

دوست ہیں اور نوعمر شعرا کی ہمت افزائی کرنا۔ شکیل کی یہ وہ خصوصیات تھیں جو انہیں ہر محفل میں نمایاں کرتی تھیں ان دنوں مشاعروں کا بازار گرم تھا۔ خاص طور پر وارفنڈ کے مشاعرے۔ ان مشاعروں میں ایک ہی شخص تھا جس سے شکیل کی ٹھنی دبتی تھی اور وہ تھا نخشب جارچوی مگر سرخوش قزلباش کے دونوں دوست تھے کیونکہ ان کا مکتبہ خاص طور پر مشاعرے کے شاعروں کا اڈا تھا۔

نخشب زیادہ تیکھا شخص تھا۔ اور اس میں اپنے مقابل پر چھا جاتے کی صلاحیت تھی۔ وہ زندگی میں نمبر ا بنکر جینے کا قائل تھا اور اسی شان سے جیا۔ مگر شکیل کا معاملہ دوسرا تھا وہ مصلحت اندیش تھا۔ اور بہت سی چیزیں اپنی مسکراہٹوں سے سر کر لیتا تھا جب نخشب دلی سے مشاعروں کی بساط چھوڑ کر فلم انڈسٹری چلے گئے تو شکیل کے لیے فضا اور سازگار ہو گئی۔ لیکن ایک ڈیڑھ سال بعد شکیل بھی بمبئی پہنچ گئے۔ دونوں میں دوستی تھی مگر اسی اندازکے ساتھ۔ بمبئی میں نخشب کی آواز خراب ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے مشاعروں میں پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مگر اپنی فلمی زندگی میں وہ شکیل سے زیادہ تابناک اور کامیاب رہے جب تک بمبئی رہے مگر بمبئی سے تنگ آکر نخشب جب کراچی چلے گئے تو گویا ایک اور دنیا میں چلے گئے شکیل نے ایک بار نخشب سے کراچی میں ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہاں نخشب نوابوں کی طرح رہتا ہے۔ ہمارا معیار زندگی کچھ بھی نہیں اس کے مقابلے میں اس نے ایک بڑا حرم بنا رکھا ہے۔ وہ کراچی میں ایک درجن سے زیادہ ریس کے گھوڑوں کے مالک تھے۔ اور اس فن میں لاثانی سمجھے جاتے تھے۔

شکیل کی شاعری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پیداوار تھی۔ اور سراسر رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کی شہرت کا آفتاب علی گڑھ سے ہی طلوع ہوا تھا مجازؔ اور جذبیؔ کے بعد شکیلؔ بدایونی اور راز مرادآبادی کی جوڑی پر سب کی نظر تھی مگر یہ دونوں اپنے پیش رو شاعروں کی سطح تک نہ پہنچ سکے۔ شکیلؔ کو مشاعروں کی سستی مقبولیت نے آگے نہ بڑھنے دیا اور رہی سہی کسر فلم نے پوری کر دی۔ شکیل بدایوں کے رہنے والے تھے۔ مگر متاثر تھے جگر مرادآبادی سے اور جگر صاحب انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے لیکن وہ جگرؔ صاحب کے اتباع میں خود فراموشی کی منزل تک تو کجا اس راستے پر بھی گامزن نہ ہوسکے۔ وہ نوجوانی میں بھی بہت محتاط رہتے تھے۔ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ہمیشہ علی گڈھ کٹ پاجامے اور شیروانی میں ملبوس نظر آتے تھے۔ تندرست۔ توانا۔ خوبصورت۔ بھرا بھرا جسم سگریٹ تک نہ پیتے تھے۔ شراب تو دور کی بات ہے ہاں ان کی جیب میں پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ضرور رہتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب میں نئی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ جدید اور ترقی پسند رجحانات مقبول ہو رہے تھے مگر شکیل وہی لکیر کے فقیر تھے۔ روایتی قسم کی ٹکسالی بندھی غزلیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کی دنیا۔ ادب کی دنیا کم اور مشاعروں کی دنیا زیادہ تھی۔ اور وہ اپنے اشعار کو مشاعروں کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔

میں ۱۹۴۵ء کے وسط میں دلی سے بمبئی چلا گیا تھا اپریل ۱۹۴۶ء میں شکیلؔ اقبال ڈے کے مشاعرے میں بمبئی آئے۔ ان کی عنائیہ شاعری اور شخصیت نے بمبئی کے فلمی حلقوں کو ایسا متاثر کیا کہ وہ پھر فلم ہی کے

ہوکر رہ گئے۔ کاردار پروڈکشن میں ملازم ہو گئے جہاں خمار بارہ بنکی مجروح سلطان پوری پہلے سے موجود تھے۔ ابتدائی چند ماہ انہوں نے مشکل سے گذارے دادر میں ایک کھولی میں رہتے تھے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ نوشاد میاں کے مزاج کو انہوں نے کچھ ایسا سمجھا کہ نوشاد اور شکیل کا نام اس طرح ایک ہو گیا جیسے غزل اور اس کی موسیقی کاردار پروڈکشن میں نہ خمار رہے نہ مجروح۔ شکیل ہی جلوہ گر رہے۔ اور فلم درد کی کامیابی کے بعد شکیل کا فلمی کیریر گویا ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا شکیل خوشامدی نہیں تھے مگر معاملہ فہم ضرور تھے۔ اور یہ معاملہ فہمی ہی ان کی فلمی زندگی کی کامیابی کا سبب بنی۔

فلمی دنیا میں شکیل کو جو درجہ اور شہرت ملی اس سے دنیا واقف ہے۔ لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ یہ درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی ادبی زندگی کو داؤ پر لگانا پڑا۔ شکیل کا قابل ذکر ادبی سرمایہ اس کا پہلا مجموعہ "رعنائیاں" ہی ہے۔ جو اس کے دہلی میں قیام کے دوران شائع ہوا تھا بعد کی شاعری میں وہ سوز اور تڑپ نہیں ہے ؎

میری زندگی ہے ظالم تیرے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

اٹھا جو مینا بدست ساقی رہی نہ کچھ تاب ضبط باقی
ہر ایک میکش پکار اٹھا یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

لیکن بمبئی پہنچ کر شکیل نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں ایسا بھی نہیں ہے وہ مخشب کی طرح ادبی ہنگاموں سے بے نیاز نہیں ہوئے تھے۔ مگر فلمی

شاعری دراصل کل وقتی (Full time mate) کام ہے۔ جہاں فلمی شاعر بیرونی مشاعروں کے چکر میں پڑا اس کی جگہ دوسرا شاعر ڈیرا جمالیتا ہے۔ اس لئے کام ہو یا نہ ہو شاعر کو میوزک ڈائریکٹر اور دیگر کلیدی لوگوں سے لگا رہنا پڑتا ہے اور اس سلسلے میں بڑے بڑے شاعروں کو مستثنیٰ انہیں قرار دیا جاسکتا۔ شکیل نے بھی اپنے آپ کو فلمی ماحول میں جماتے میں بڑی بڑی جدوجہد کی اور اسے دادر کی کھولی سے باندرہ کے فلیٹ تک پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ دراصل شکیل نے اطمینان کا سانس تب لیا جب نوشاد کے نیچے والے فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی اور پھر وہ دور شروع ہوا کہ نوشاد صرف شکیل سے ہی گانے لکھاتے تھے۔ اس اتحاد نے شکیل کو فکر معاش سے بے نیاز کر دیا تھا بلکہ وہ کئی اور شاعرں کو اپنے یہاں رکھ کر انہیں کھلانے پلانے کے قابل ہو گئے تھے۔

یہ فلمی موجہ سر کرنے کے بعد شکیل نے اپنا رخ پھر ادب کی طرف موڑا مگر زمانہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ شکیل نے چند غزلیں ایسی بھی کہیں جن میں ترقی پسند شعرا پر طنز تھا۔ مگر شکیل کے یہ تیر بے اثر ثابت ہوئے اردو غزل میں نئے رجحانات داخل ہو چکے تھے۔ اور شکیل کی غزل ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اتفاق سے یہی زمانہ بمبئی میں مجروح کی ناکام فلمی زندگی اور کامیاب ادبی زندگی کا زمانہ ہے۔

لیکن شکیل نے اپنے لئے ایک راہ نکال لی تھی انھوں نے حکیم مرزا حیدر بیگ اور نذر بیہوروی کو پھانس لیا تھا۔ جنہیں مشاعروں میں چمکنے کا ہوکا تھا۔ یہ لوگ روپیہ بھی خوب خرچ کرتے تھے۔ شکیل نے مقامی شاعروں کی کمان سنبھال لی۔ اور بمبئی کے مقامی آل انڈیا مشاعروں میں

ایک عرصہ تک شکیل کا طوطی بولتا رہا۔ شکیل بانو مشاعرے کے صدر ہوتے یا افتتاح کرتے یا منتظم ہوتے خمار بارہ بنکی بھی ان کے ساتھ لگے رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے اور صبا افغانی (مرحوم) اور شکیل نعمانی تو گویا ان کے خانہ زاد تھے۔ بمبئی کے جس مشاعرے میں شکیل کا عمل دخل ہوتا اس پر شکیل کی شخصیت کی چھاپ ہوتی۔ اس مشاعرے میں زیادہ مترنم شعراہی بلائے جاتے۔ بمبئی کے مقامی ترقی پسند شعرا شکیل کے مشاعروں میں شاذ ہی شرکت کرتے تھے ترقی پسندوں کی مخالفت کو وہ اپنا ادبی ایمان تصور کرتے تھے ؎

"غم عشق کے مخالف غم عام تک پہ پہنچے   مرے سامنے تو آئے مرے نام تک پہ پہنچے"

اس کاروباری داؤ پیچ اور شاعرہ بازی سے قطع نظر شکیل بے حد مخلص انسان تھے اور بہت مہمان نواز۔ بڑے متواضع ان کے گھر ان کے احباب کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اور شکیل سب کو اپنے لطیفوں اور شعروں اور مرغن کھانوں سے نوازتے تھے اور کئی شاعر دوست تو مستقل ان کے گھر میں ہی پڑے رہتے تھے۔ وہ مجلسی آدمی تھے شعر سننے اور سنانے کا ان کو شوق تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں کا کلام ٹیپ ریکارڈ کر کے ایک اچھی خاصی لائبریری بنا رکھی تھی۔ جو اگر موجود ہو گی تو اس کی حیثیت نوادرات کی سی ہو گی کیونکہ بہت سے شعرا دنیا سے اٹھ گئے اب ان کی آواز انمول ہے۔ شکیل وضعدار آدمی تھے۔ جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے ان سے آخری وقت تک دوستی نبھائی! مگر ان کے احباب نے آخر۔ آخر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انتقال سے چند سال پہلے وہ ٹی۔ بی کے موذی مرض کے

شکار ہوئے ذیابیطس کے مریض پہلے ہی سے تھے۔ اس موڑ پر آکر ان کے ملنے والوں میں سرد مہری آگئی۔ اپنے علاج کے سلسلے میں وہ کافی عرصہ پنچ گنی سنی ٹوریم میں رہے۔ پنچ گنی سے کسی قدر صحت یاب ہو کر لوٹے تو ان کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ دنیا والے چلتی کے ساتھی ہیں۔ برے وقت میں اپنے بھی آنکھ پھیر لیتے ہیں۔ جو لوگ کبھی شکیل کے دسترخوان کے خوشہ چیں تھے۔ وہ بھی ان کی برائیاں کرنے لگے تھے۔

شکیل سے میری آخری ملاقات ان کے باندرہ والے نئے فلیٹ میں ہوئی اس فلیٹ میں وہ تنہا رہتے تھے۔ پرانے فلیٹ میں بیوی بچے رہتے تھے۔ یہ جون ۶۷ ۱۹ء کا ذکر ہے۔ میں بمبئی ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ شکیل کی مزاج پرسی کو ان کے گھر گیا تو وہ بہت تپاک سے ملے۔ اور اصرار کیا کہ ان کے گھر ٹھہروں میں نے معذرت پیش کی کہ مشاعرہ تو ایک بہانہ ہے۔ بیوی بچوں کے ساتھ بمبئی گھومنے آیا ہوں۔ ۱۹۵۸ء میں میرا تبادلہ بمبئی سے دہلی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں تو کئی بار بمبئی آیا۔ مگر بال بچوں کو پہلی بار بمبئی لایا ہوں۔ شکیل نے میری معذرت قبول کر لی اور اگلے دن ہم سب کی پر تکلف دعوت کی۔

اس شام اپنے سینے کے زخموں کو چھپا کر شکیل اپنے روایتی انداز میں قہقہے لگاتے رہے۔ لطیفے سناتے رہے۔ اور دبے دبے الفاظ میں احباب کی بے رخی کا شکوہ بھی کیا۔ بس وہ ملاقات شکیل سے آخری ملاقات تھی۔ کچھ عرصے بعد خبر ملی کہ وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اور اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو آبدیدہ چھوڑ گئے۔
شکیل کے اشعار لوگ آج بھی پڑھتے ہیں۔ شکیل کے گانے آج بھی سنتے ہیں۔ مگر شکیل کہاں ہے اس مخلص انسان کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں جس سے آخری وقت میں اس کے دوستوں نے بھی وفا نہ کی اور یہ زندگی تو بھلا کس کی ہے۔

خوابوں کا شہزادہ
ساحر[1]

یہ غالباً ۱۹۴۴ء کی بات ہے رسالہ "آج کل" کے سرورق پر "تاج محل" کی تصویر چھپی تھی اور اس سے متعلق ایک نظم "میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے" اس نظم نے دل کو چھو لیا۔ یہ نظم تھی ساحر لدھیانوی کی یہ وہ دور تھا جب فیض اور راشد، میرا جی اور اختر الایمان، اور مجاز و جذبی و جاں نثار اختر کا طوطی بولتا تھا۔ ہر تنقیدی مضمون میں ان چند ناموں کی گردان ہوتی تھی۔ اس ادبی ماحول میں ساحر لدھیانوی کا نام آہستہ خرامی سے منظرِ عام پر آیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم شباب پر تھی۔ میں اُن دنوں دلی میں جنگ سے متعلق جنرل ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ دفتر میں کلرکی۔ اور باقی اوقات میں مطالعہ اور شعر و شاعری۔ یہ اس زمانے میں مجھ جیسے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کا معمول تھا۔ ساحر کی نظم بہت اچھی

---

[1] ساحر لدھیانوی ولادت ۸ مارچ ۱۹۲۱ء وفات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء

تھی اور پھر جہاں کہیں یہ نام نظر آتا۔ میں ضرور پڑھتا۔ میں ذہنی طور پر حلقہ ارباب ذوق" سے متاثر تھا اور میری نظمیں ہمایوں، ادبی دنیا، اور شاہکار اور نیرنگ خیال وغیرہ میں چھپتی تھیں۔ یہ سب رسالے لاہور سے نکلتے تھے مگر ۱۹۴۵ء کے اوائل میں مجاز کی صحبت نے مجھے ترقی پسندی کی طرف مائل کیا۔ اور جب اگست ۱۹۴۵ء میں میں بمبئی گیا تو سید سجاد ظہیر کی زیر قیادت ترقی پسند مصنفین کے کارواں میں شامل ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کانفرنس ہوئی تو اس میں شرکت کرنے کے لیے پنجاب سے صرف ایک شخص آیا۔ ساحر لدھیانوی۔ دبلا پتلا، لمبا نوجوان۔ آنکھوں میں تجسس، چہرہ پر یاس و حرماں کے آثار کوٹ پینٹ میں ملبوس۔ ڈھیلی سی ٹائی (اس زمانے میں کم سے کم جلسوں میں شاعر کوٹ پینٹ نہیں پہنتے تھے) میری ہی جیسی عمر، ساحر اس وقت "ادب لطیف" کا ایڈیٹر تھا اس کانفرنس میں اس نے ایک رواں دواں مقالہ پڑھا ترقی پسند شاعری کے بارے میں جسے پسند کیا گیا اس کانفرنس میں میری ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی اور ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

آج ۳۵، سال بعد اس ملاقات کو یاد کرتا ہوں تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ساحر اس بزم آب و گل سے اٹھ کر جا چکے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ گزاری ہوئی ان گنت شامیں اور ہزاروں ناقابل فراموش لمحات خوشگوار یادوں کی صورت میں اس طرح تازہ ہیں کہ بقول جگر ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

بے تکلف دوستوں کی اہمیت کا احساس واقعی اس وقت ہوتا ہے جب وہ

جدا ہو جاتے ہیں میرے ساتھ کچھ یہی حال ساحرؔ کا ہے۔

ساحرؔ ایک سرتاسر شاعر اور قلم کار تھا جسے معاشی مزدوریاں اور مجبوریاں فلم کی طرف گھسیٹ لائی تھیں۔ اب یہ بات اور ہے کہ اس نے فلم میں آکر کبھی اپنے ادبی فنکار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور اپنی بہت سی معیاری نظموں کو فلم کے میڈیم سے زباں زد خاص و عام کرا کر چھوڑا، اور فلمی شاعری کو ایک خوبصورت موڑ دیا۔ ساحرؔ کا یہ کارنامہ ادبی اور فلمی دونوں حلقوں میں یاد رکھا جائے گا۔

ساحرؔ اس تلخ حقیقت کی ایک روشن مثال ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ادب ادیب کو دھکے دے کر اپنی محفل سے نکالتا ہے اور اسے غیر ادبی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر ادب لطیف' اور 'سویرا' کی ادارت ساحرؔ کو معاشی خوشحالی فراہم کرتی تو وہ اپنے اس ادبی ذوق کا گلا گھونٹ کر لاہور سے بمبئی کبھی نہ آتا۔ شہرت نے تو اس کے قدم چوم لیے تھے دولت اس سے کوسوں دور تھی۔

وہ فلمی دنیا میں پہلی بار ۱۹۴۶ء میں آیا۔ ایک نئی فلم کمپنی (کچھ کلا مندر قسم کا نام تھا اس کا) میں بحیثیت کہانی کار، مکالمہ نویس وغیرہ وغیرہ۔ مگر کچھ عرصہ بعد ادبی زندگی کی تڑپ اسے واپس لے گئی دہلی۔ دہلی سے اس نے "شاہراہ" جیسا پرچہ نکالا۔ لیکن والئے مجبوری! اسے پھر بمبئی کی فلمی زندگی میں واپس آنا پڑا۔ اس بار وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر آیا تھا اور طویل جدوجہد کے بعد آخر کار فلم 'بازی' اس کی پہلی فلمی کامیابی کی سیڑھی ثابت ہوئی۔ فلم کا بازار ایسا بازار ہے جہاں اپنے بیگانے اور دوست رقیب بن جاتے ہیں۔ 'بازی' سے پہلے ایس۔ ڈی۔ برمن

نے کوشش کی تھی کہ ساحر شاہد لطیف کی زیر تکمیل فلم کے گانے لکھیں۔ مگر واہ رے معاصرانہ چشمک۔ ادیب فلمکار شاہد لطیف نے برمن سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ ساحر سے گانے لکھوائیں گے تو میں اپنی فلم میں آپ کا میوزک نہیں لوں گا۔ یہ تو ایک مثال ہے مجھے علم ہے کہ ساحر نے فلم کی سنگلاخ زمین میں بار پانے کے لیے بہت سی کڑی منزلوں کو سر کیا تھا۔ اور اس لیے جب فلمی شائقین نے اس کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھ دیا تو اس نے انتقاماً نہیں۔ ضرورتاً۔ عزتِ نفس کی خاطر اپنے فن اور عظمت کا لوہا منوایا۔ قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے بعد ساحر نے اپنی اچھی ادبی نظمیں فلم میں دیں اور ثابت کیا کہ شاعر بھی فلمی ماحول میں ایک باوقار ہستی ہے۔ اور ایک زمانہ وہ بھی آیا جب ساحر کے گانوں کی بنا پر موسیقاروں کی مقبولیت ہوتی تھی اس وقت اس نے بساطِ فلم پر نہایت ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی میوزک ڈائریکٹر سے کم معاوضہ نہیں لے گا۔ یہاں تک کہ جب میاں کاردار نے ساحر کو اپنی ایک فلم کے گانے لکھنے کے لیے بلایا تو ساحر نے اپنے روایتی شائستہ انداز میں کاردار صاحب سے کہا کہ نوشاد صاحب آپ کے دیرینہ دوست ہیں اور آپ سے نسبتاً کم معاوضہ لیتے ہیں بہر حال میں اتنا ہی معاوضہ لوں گا جتنا آپ نوشاد صاحب کو دیں گے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کاردار صاحب نے ساحر کی شرط قبول نہیں کی اور ساحر نے انکے لیے گانے نہیں لکھے۔

ساحر نے فلم فیئر ایوارڈ بھی یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ آپ مجھے اس سال کے بہترین گیت کار کا ایوارڈ دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے پہلے میں اچھا گیت گار نہیں تھا۔

اپنی فلمی زندگی میں ساحر کا یہ رویہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ مغرور تھا یا کسی قسم کی بداخلاقی برتتا تھا بلکہ ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ وہ دراصل ادب اور ادیب وشاعر کی عظمت پر اصرار کرتا تھا اور اپنے عمل سے دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ شاعر ایک باعزت فنکار رہے۔

ساحر ایک سنبھلے ہوئے متوازن ذہن کا حساس ادیب تھا۔ محض جذبات کی رو میں بہنے والا شاعر نہیں۔ مشاعروں سے وہ دور رہا کرتا تھا مگر جب مشاعرہ اس کے سر پڑ جائے تو نہایت کامیابی سے اپنا کلام پڑھتا تھا اور محفل پر چھا جاتا تھا۔ ویسے وہ نہ ترنم باز تھا نہ مشاعروں کے اسٹیج پر لفنگے بازی کرتا تھا۔ ادبی جلسوں اور کانفرنسوں میں وہ عام طور پر خاموش ہی رہتا تھا۔ اور کوئی بات کرتا تو محتاط دھیمے لہجے میں۔ خواہ تقریر بازی اور اکھاڑ پچھاڑ اس کا شیوہ نہ تھا۔ مگر جب "سخن گسترانہ" بات آجائے تو اپنی بات معقول دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کرتا تھا کہ مخالف بھی لوہا مان جائیں۔

بمبئی کا ایک واقعہ ہے۔ جن دنوں ادب میں جمود کی بحث چل رہی تھی اور ادب میں نعرہ بازی اور غلغلہ انگیز شاعری کا محاسبہ کیا جانا شروع ہو چکا تھا ساحر نے کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک بھرپور تنقیدی مضمون لکھا اور ادبی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ کیفی اعظمی اول تو شاعر ہی نہیں ہے۔ اور ہے تو تیسرے درجے کا۔ یہ مضمون انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار نشست میں پڑھا گیا۔ جعفری صدر تھے۔ یہ مضمون عام طور پر پسند کیا گیا۔ سردار جعفری نے ساحر کے مضمون کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی مگر ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ اہل محفل ساحر کے ہم نوا ہو گئے۔

اگلے ہفتے انجمن کی نشست میں ردِ عمل کے طور پر سردار جعفری نے

ساحر کی شاعری کے بارے میں ایک مضمون پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ ساحر کی مشہور نظم "تاج محل" ہمارے قومی ورثہ کی تضحیک کرتی ہے اس لیے وہ نہایت رجعت پرستانہ ہے اور اس کی شاعری گھٹیا شاعری ہے۔ ساحر لدھیانوی نے مضمون کو سکون سے سنا اور بعد میں کہا: "اس مضمون سے آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی شاعر نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی اچھا شاعر ہے۔ ساحر کے ایک ہی جملے سے سردار جعفری کے مضمون پر پانی پھر گیا۔

ساحر یاروں کا یار اور دوستوں کا دوست تھا اس کے خلوص و محبت میں آخری وقت تک کوئی کمی نہیں آئی۔ ریاکاری اس کے مزاج میں نہ تھی دوست نوازی، بلکہ احباب پروری اس کی فیاضانہ طبیعت کا خاصہ تھی۔ اور اس جاگیردارانہ روایت کو اس نے ہمیشہ اپنے گلے سے لگائے رکھا۔ بمبئی میں اس کے ساتھ ہر زمانے میں ایسے لوگ رہتے تھے۔ جو اس کی مصاحبت کرتے تھے اور اپنے ان مصاحبوں کو وہ خوب نوازتا تھا۔ (نام گنانے کی ضرورت نہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں) کچھ مشہور شعراء اور میوزک ڈائرکٹر بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں جب ساحر بمبئی آئے تو ساتھ آئے حمید اختر۔ اس زمانے میں ساحر نے کوشش کی کہ اپنے اور دوستوں کو بھی بمبئی بلائے۔ حیدرآباد سے ابراہیم جلیس آ گئے۔ لکھنؤ سے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور بھی اسی چکر میں بمبئی آئی تھیں۔ یہ دونوں رہتی تو تھیں اپنی بڑی بہن عشرت درانی کے ساتھ (بیگم جی۔ ایم۔ درانی) مگر ہاجرہ مسرور اور ساحر کی دوستی سے ہم لوگوں نے ایک خوشگوار ادبی جوڑے کی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں جو پوری نہ ہو سکیں۔ اور یہ خواب ادھورا رہا۔

جب کلا مندر کی محفل برخواست ہوگئی تو یہ لوگ بھی بمبئی چھوڑ گئے۔ مگر بمبئی کا وہ زمانہ اس اعتبار سے بہت دلچسپ تھا کہ ساحر پوری طرح فلم میں جذب نہیں ہوئے تھے اور ان کی توجہ ادب کی طرف ہی زیادہ تھی۔ یتے بھائی کے گھر ہفتہ وار ادبی نشست کے علاوہ ریڈیو اسٹیشن اور قدوس صہبائی کے دفتر نظام ویکلی میں ہم لوگ اکثر ملتے تھے مجھے یاد ہے کہ قدوس صہبائی نے نظام کے مزاحیہ کالم "رنگ ترنگ" میں ایک دکاہیہ لکھا تھا "چار اونٹ" یہ ہم چار لمبے لمبے نوجوان دوستوں کی سرگشتی کی داستان تھی۔ ہم لوگ نظام کے دفتر واقع جے۔ جے۔ ہسپتال سے پیدل چلتے اور رنگین بازاروں کے چکر کاٹتے بائیکلا تک پہنچتے یہ چار اونٹ تھے۔ ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس، حمید اختر، اور یہ راقم الحروف رفعت سروش۔

ساحر اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ یار میں بس یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی لڑکی دوست ہو جس کے ساتھ ڈبل ڈیکر بس میں گھوما کروں (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ)۔

اس سلسلے میں ساحر کی زندگی مسلسل آرزو تھی۔ محبت کا یہ سکندر آب حیات تک نہ پہنچ سکا اور عمر بھر پیاسا رہا۔ یہ ساحر کی زندگی کا ایک المناک نفسیاتی زاویہ ہے کہ اسے اپنے عہد کے حسینوں کے دلوں میں تو جگہ ملی مگر وہ اپنا خرابہ آباد نہ کر سکا۔

زندگی نے ساحر کو سب کچھ دیا، شہرت، عزت، دولت، اپنے وقت کا کامیاب ترین فلمی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ساحر نے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا۔ سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ سے اسے نوازا گیا۔ وہ پدم شری ہوئے اور بمبئی جیسے شہر میں جہاں فٹ پاتھ پر بھی سونے کو جگہ نہیں ملتی۔

ایک جہاز نما بلڈنگ "پرچھائیاں" کے مالک تھے۔

مگر ساحر جو کچھ اپنے دور اور آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں وہ ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات "تلخیاں" "پرچھائیاں" "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" وہ خوابوں کا شہزادہ تھا، خوابوں میں رہا، خوابوں میں بسا اور آخر خواب ہوگیا۔ ایسا خواب جسے آنے والی نسلیں ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بسائے رکھیں گی۔

یہ مشاعرے

دسمبر ۱۹۳۸ء کی بات ہے نگینہ (بجنور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ میں ان دنوں اُردو مڈل پاس کرنے کے بعد اسکول میں پڑھتا تھا۔ شعر کہنے کا شوق مجھ اپنے بڑے بھائی سید اشتیاق علی شوقؔ اور ان کے دوست بخشش جارچوی کی دیکھا دیکھی مڈل اسکول کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا اور بہت سے ٹوٹے پھوٹے شعر کہے تھے۔ نگینہ کے جاگیردارانہ ماحول میں مشاعرے ہی تفریحِ طبع کا ذریعہ تھے۔ ان دنوں نگینہ میں دو استاد تھے، ایک شاگرد داغؔ اختر نگینوی اور دوسرے بابو فخرالدین محزوںؔ جو کبھی دلی ان سنگھ مفتونؔ کے رسالہ 'ریاست' سے متعلق رہ چکے تھے۔ ان دونوں کے شاگردوں کی ٹولیاں تھیں ایک اور معتبر شاعر مولوی خورشید عالم شمیمیؔ تھے (اب دہلی میں مقیم ہیں) جنھیں مشاعرہ بازی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

ان دنوں طرحی مشاعرے ہی ہوتے تھے۔ غیر طرحی کلام بعد میں سنایا جاتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مصرعِ طرح تھا ــــ "تہ و بالا کیے کیا کیا زمین و آسمانیں نے"۔ میں نے غزل کہی اور محزوںؔ صاحب کے پاس بغرضِ اصلاح لے گیا کیونکہ

ان کا مکان ہمارے مکان کے قریب تھا۔ انھوں نے میرے شعر یک قلم کاٹ دیئے اور اپنے کچھ شعر لکھ کر مجھے دے دیئے۔ یہ مانگے کے اشعار مجھے ذرا پسند نہ آئے اور طے کر لیا کہ مشاعرے میں اپنے ہی شعر پڑھوں گا۔ زندگی کا پہلا مشاعرہ ــــ پہلا تجربہ ــــ دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔

مولوی ظہیر عالم کے دیوان خانے میں بعد نمازِ عشاء مشاعرہ شروع ہوا۔ شعرا کی فہرست حسبِ مراتب ترتیب دی گئی تھی۔ ظاہر ہے میرا نام مبتدی شعرا کے ساتھ دوسرے یا تیسرے نمبر پر تھا۔ ظہیر عالم صاحب صدر تھے اور وہی شعرا کو دعوتِ کلام دے رہے تھے۔ ان دنوں صدرِ مشاعرہ محض نمائشی چیز نہیں ہوتا تھا بلکہ عملی طور پر مشاعرے کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ الگ سے کسی اناؤنسر یا "میرِ مشاعرہ" کا رواج نہیں تھا۔ نہ شعرا کو پکارتے وقت ان کے نام کے ساتھ سفارشی جملے کہے جاتے تھے۔ شاعر کا تعارف اس کا کلام تھا۔ صدرِ مشاعرہ آخر وقت تک مشاعرے میں بیٹھتا تھا اور سامعین بھی آدابِ محفل کا پورا خیال رکھتے تھے ــــ میرا نام پکارا گیا تو دل دھڑکنے لگا۔ خود کو سنبھالتا ہوا اسٹیج پر پہنچا تو ایسا محسوس ہوا جیسے پانی میں تیر رہا ہوں ــــ بہ مشکل تمام غزل پڑھی، اس شعر پر خاصی داد ملی ؎

زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے برگِ افتادہ
بڑھائی تھی کسی دن زیبِ صحنِ گلستاں میں نے

مگر بابو فخر الدین محزوں منہ بنائے بیٹھے رہے جب غزل پڑھ کر واپس آیا تو کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا "کسی سے لکھوا کر لایا ہے" ــــ بڑا غصہ آیا، مگر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا اور دل میں تہیہ کر لیا۔

کہ لوگوں سے اپنی شاعری کا لوہا منوا کر رہوں گا۔

مشاعرہ رات کے بارہ بجے تک چلا۔ مزاحیہ شعرا کو آخیر میں پڑھنے کا موقع دیا گیا اور جن ایک دو شعرا نے طرحی غزلیں نہیں کہی تھیں انھیں آخیر میں غیر طرحی کلام سنانے کی دعوت دی گئی ــــــ اس مشاعرے کی ایک دلچسپ بات جو آج تک یاد ہے وہ ہے محزوں صاحب کا "لاوڈ اسپیکر" فہرست کے اعتبار سے اختر نگینوی سے پہلے محزوں صاحب کا نام پکارا گیا تو ان کے ساتھ ایک خوش شکل و خوش گلو لڑکا بھی اسٹیج پر نمودار ہوا اور اس نے محزوں صاحب کی غزل وجد آفرین ترنم سے پڑھنی شروع کی غزل وہ لڑکا پڑھ رہا تھا اور داد وصول کر رہے تھے محزوں صاحب جیسے ہی سامعین کی صفوں سے داد کی یلغار ہوتی، محزوں کے ہاتھ داد وصول کرنے کے لیے حرکت میں آجاتے چابی بھرے کھلونے کی طرح کیا خوب شعر تھا۔ ؎

"بگولا بن کے شاید اڑ رہی تھی قیس کی ہستی

جسے صحرا میں سمجھا تھا غبارِ کارواں میں نے"

اختر نگینوی کا شمار شہر کے رئیسوں میں تھا وہ اپنے استاد حضرت داغ کے رنگ میں زبان کے شعر کہتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ شعر پڑھتے وقت ان کا بایاں ہاتھ زیادہ حرکت کرتا تھا اور یہ وضع ان پر خوب کھلتی تھی۔ محزوں صاحب مضمون آفرینی میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھاتے تھے۔ دونوں استادوں میں خوب چشمک رہتی تھی مگر محفلِ مشاعرہ کی حد تک۔ ایک دوسرے کے ذاتی وقار کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ نہ ان کے شاگردوں کو یہ جرأت تھی کہ دوسرے کے لیے ساقط المعیار

جملے استعمال کریں۔

گذشتہ چالیس سال میں میں نے ہندوستان کے طول و عرض میں نہ معلوم کتنے مشاعرے پڑھے ہیں مگر آج بھی نگینہ کے ان روایتی مشاعروں کا نقش ذہن میں محفوظ ہے ــــ ایک خوشگوار ادبی روایت کی جھلملاتی شمع کی طرح۔

مشاعروں کی اس ادبی روایت کی مٹی پلید ہوئی مصلحت انگیزی کے ہاتھوں جب مشاعرے ادبی ذوق کی تسکین کے بجائے مخصوص سیاسی یا سماجی مقاصد کے آلۂ کار بننے لگے۔ اس ناخوشگوار مقصدیت نے مشاعروں کی ادبی روح کو کچل دیا، شعری لطافتوں اور نزاکتوں کو مجروح کر دیا شعرا میں کاروباری ذہنیت کو بیدار کر دیا اور مشاعرے اکھاڑے بن گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران "وار فرنٹ" کے زیرِ اہتمام بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ اور چونکہ یہ مشاعرے انگریزی سرکار کے جنگی پروپیگنڈے کے لیے ہوتے تھے اس لیے روپیہ کی فراوانی تھی۔ شعرا کو معاوضہ دینے کا چلن عام ہوا تو تجارتی ذہنیت بھی عود کر آئی۔ اب مخصوص آل انڈیا قسم کے شعرا کی ایک مخصوص فہرست بن گئی جس میں معمولی رد و بدل ہوتی تھی اور ان شعرا کی ٹولیاں وار فرنٹ کے زیرِ اہتمام شہر شہر مشاعرے پڑھتی پھرتی تھیں۔ اب شاعر کی عظمت کی کسوٹی اس کا حسنِ کلام نہیں، حسنِ بیان ٹھہرا جس نے زیادہ رنگ جمایا اس کی مانگ زیادہ ہوئی۔ مول بھاؤ ہونے لگا اور اس طرح پیشہ ور شعرا کا ایک اچھا خاصا گروہ پیدا ہو گیا اس کے علاوہ بہت سے شعرا نے مشاعرے پڑھنا اپنا پارٹ ٹائم بزنس

بنالیا۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس صف میں اس زمانے کے اکثر مشہور شعرا نظر آتے ہیں۔ وارفرنٹ کے مشاعروں کے منتظمین میں حفیظ جالندھری اور کنور رنگھ مہندر سنگھ بیدی سحر سرِ فہرست ہیں۔ اور اس روش کو عام کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔

آج طرحی مشاعرے ماضی کی چیز بن چکے ہیں۔ (مخصوص نشستیں اس زمرہ میں نہیں آتیں) مشاعروں میں تقدیم وتاخیر شعرا کے مراتب کے اعتبار سے نہیں بلکہ "رنگِ مشاعرہ" کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مقبول شعرا اپنا مخصوص مقبول کلام ہر جگہ سناتے ہیں اور اس میں مبالغہ نہیں کہ بہت سے شعرا کی ملک گیر مقبولیت کا راز ان کی صرف چند غزلیں یا نظمیں ہیں۔

جب شاعری جنسِ تجارت بن گئی تو اس کی فروخت کے بھی نئے نئے انداز اختیار کیے جانے لگے مشاعروں میں پہلے دارانا ؤنسمنٹ کا رواج ہوا۔ دہلی میں نواب خواجہ محمد شفیع اس فن کے ماہر تھے اور رعایتِ لفظی کے بادشاہ۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں اناؤنسمنٹ کرتے تھے۔ خود شاعر نہیں تھے مگر خاصے معاوضہ پر مشاعروں کی صدارت کرنے کے لیے اس وجہ سے بلائے جاتے تھے کہ ان کی پھبتی دارانا ؤنسمنٹ سے مشاعرہ خوب جمتا تھا۔ آگے چل کر مشاعرے کی صدارت تو محض ایک نمائشی چیز بن کر رہ گئی اور اناؤنسمنٹ کرنا ایک پیشہ بن گیا۔ اس میدان میں بھی پیشہ ورانہ چشمک شروع ہو گئی۔ اور آج مشاعروں کی اناؤنسمنٹ رعایتِ لفظی اور ادبی سطح سے گر کر لطیفہ گوئی اور جملے بازی تک آگئی ہے۔

جولائی ۴۳ سے اگست ۴۵ تک اپنے قیام دہلی کے دوران میں نے وارفرنٹ کا کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا۔ البتہ مخصوص نشستوں خاص

طور پر ہارڈنگ لائبریری اور خواجہ محمد شفیع کے مکان پر مجاز، جذبی، نہال سیوہاروی، اختر الایمان، عرش ملسیانی، خورشید الاسلام، عطا محمد شعلہ، مختار صدیقی، راز، شکیل اور جمیل الدین عالی وغیرہ کو سننے سنانے کا سلسلہ جاری رہا۔

اگست ۴۵ء میں میں دہلی سے بمبئی چلا گیا اور وہاں مشاعروں کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ یہ تھے انقلابی مشاعرے بمبئی میں جب میں سردار جعفری، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف وغیرہ سے ملا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف کھنچتا چلا گیا اور اس مسلک کا قائل ہو گیا کہ ادب کو زندگی سے الگ نہیں رکھا جا سکتا ـــــ انقلابی مشاعروں کی روح و رواں تھے سردار جعفری اور کیفی اعظمی۔ میں بھی ان کا ہم نوا ہو گیا بعد میں اس گروہ میں مجروح سلطانپوری، ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، نیاز حیدر، وشوامتر عادل، حبیب تنویر اور جاں نثار اختر بھی شامل ہو گئے اور اچھا خاصہ کارواں بن گیا ـــــ مدنپورہ، منگلی، کردری، مستان تالاب اور کاوس جی جہانگیر ہال کے انقلابی مشاعرے ہمیشہ یاد رہیں گے جب ہم لوگ جوشیلی نظمیں پڑھتے تھے اور شعرا اور سامعین چند باتی طور پر ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔ وہاں کلام کی صحیح داد ملتی تھی اور یہ معاوضہ چاندی کے سکوں سے کہیں بیش قیمت تھا۔

شکیل بدایونی اور خمار بارہ بنکوی نے حکیم مرزا حیدر بیگ حیدر دہلوی کی سرپرستی میں ایک نیا گروہ بنا رکھا تھا اور تفریح طبع کے لیے ایک مالدار متشاعر کو استاد سخن بنا دیا تھا جس کا کلام مترنم لڑکے پڑھتے تھے مشاعرہ میں۔

اکتوبر ۴۵ء میں حیدرآباد (دکن) میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے

آل انڈیا کانفرنس ہوئی اور ملک بھر سے نمایندہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ میں بھی بمبئی کے ادبی کارواں کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوا (کرشن چندر نے اسی کانفرنس کا رپورتاژ "پودے" کے نام سے لکھا ہے) اس کانفرنس کے دوران چادرگھاٹ کالج کا ایک مشاعرہ آج تک یاد ہے۔ مخدوم محی الدین، سردار جعفری، وامق جونپوری، ساحر، سلیمان اریب، نظر حیدرآبادی، کنول پرساد کنول ـــ سبھی شعرا موجود تھے مشاعرہ ڈاکٹر عبدالعلیم کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر علیم ترقی پسند مصنفین کے صف اول کے رہنماؤں میں سے تھے اور ان دنوں بہت فعال تھے ـــ بہت کامیاب مشاعرہ ہوا سردار نے "نئی دنیا کو سلام" کا ایک حصہ سنایا، ساحر نے "تاج محل"، وامق نے گیت گایا ـــ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔ مخدوم نے "سرخ سویرا" کا نغمہ چھیڑا غرض ہم سب نے انقلابی نظمیں پورے جوش و خروش سے پڑھیں۔ اخیر میں ڈاکٹر علیم نے ولولہ انگیز تقریر کی اور ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تقریر کا رخ اس طرف موڑ دیا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ طالب علم کالجوں کے کلاس روم چھوڑ دیں اور میدان عمل میں آکر الکشن کے لیے کام کریں اور انقلاب کا پرچم بلند کریں ـــ ۴۶ء کا حیدرآباد آج کے حیدرآباد سے بالکل مختلف تھا۔ اس ماحول میں ڈاکٹر علیم کی للکار بجلی کی طرح کوندی اور انقلابی نظموں نے جو کیفیت اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ اس پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ یہ رنگ دیکھ کر کالج کے پرنسپل کے ہوش اڑ گئے۔ اسٹیج پر آئے اور دخل در معقولات کرنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر علیم کی تقریر انقلابی خیالات کا ایک سیل رواں تھی، اسے ایک کالج کا پرنسپل کیا روک سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا گیا۔

ترقی پسند مصنفین کی ہر کانفرنس جس میں حسرت موہانی، قاضی اعبدالغفار پرویز شاہدی، ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، احتشام حسین، ڈاکٹر علیم، فراق گورکھ پوری، ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں اور سبط حسن جیسے سربرآوردہ ادیب شریک تھے ترقی پسند تحریک کا ایک نیا سنگ میل ثابت ہوئی اس کانفرنس کی کامیابی کے جہاں اور صحت مند اثرات مرتب ہوئے وہاں ترقی پسند شاعروں کو بھی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور انقلابی مشاعروں کا فروغ ہوا جن کا گہوارہ بمبئی تھا۔

حیدرآباد کی کانفرنس کی کامیابی نے اور شہروں میں بھی اس طرح کی کانفرنسوں کے لیے فضا ہموار کر دی تھی، رائے پور، احمد آباد، بھوپال اور بھیمڑی کی کانفرنسیں اس امر کا ثبوت ہیں ـــــ رائے پور میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ۴۶ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں بمبئی اور حیدرآباد کے ادیبوں کے علاوہ مدھیہ پردیش کے بہت سے ادیب شامل تھے جیسے صدیقہ بیگم سیوہاروی (جو اس وقت گوندیا رہتی تھیں) اطہر پرویز، انور عنایت اللہ اور حامد عزیز مدنی بمبئی سے سردار جعفری، قدوس صہبائی (ایڈیٹر نظام ویکلی) ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی اور میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کے علاوہ بمبئی سے ساغر نظامی اور ان کی بیگم کو بھی کانفرنس کے مشاعرے کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔

دو روزہ کانفرنس کا اہتمام یہ تھا کہ دن میں مقالات پڑھے جائیں گے اور رات کو مشاعرہ ہوگا ـــــ پہلے مشاعرے کی صدارت بیگم زیدی نے کی۔ ہم لوگوں کے علاوہ حیدرآباد سے بلیماں اریب، سردار الہام، شاہد صدیقی اور کنول پرشاد کنول بھی اس مشاعرے میں شریک تھے ـــــ مشاعرے میں انقلابی

نظموں کا ایسا دور چلا کہ عشقیہ کلام سنانے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جب ساغر نظامی کی باری آئی تو انھوں نے انقلابی شاعری سے اپنے دیرینہ رشتے کا اعلان کرتے ہوئے ایک نظم سنائی ـــ ع

"اے جوانو! ـــ نوجوانو ـــ"

اس نظم میں ہندوستانی نوجوانوں کو دعوتِ انقلاب دی گئی تھی نظم خوب چلی اور کامیاب انقلابی مشاعرہ ہوا۔ مگر دوسرے دن معلوم ہوا کہ ساغر صاحب کے میزبان ڈپٹی کمشنر صاحب مشاعرہ کی انقلابی فضا سے بہت دل برداشتہ ہوئے (اور ہونا بھی چاہیئے تھا) آخر سرکارِ انگلشیہ کے وفادار ملازم تھے) انھیں یہ امید نہ تھی کہ ان کے ہی شہر میں اور ان کی بیگم کے زیرِ صدارت انقلابی نغمے گائے جائیں گے۔

بہر حال اگلے دن بزمِ مقالات کے بعد رات کو پھر مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ساغر نظامی صاحب کو سونپی گئی۔ آج مشاعرہ رنگ ہی بدلا ہوا تھا شاہد صدیقی نے غزل پڑھی، کنول پرساد کنول نے رومانی گیت، سلیمان اریب نے بھی غزل سے کام نکال لیا۔ گویا سب نے جوتا تک ادا کیا۔ جب آخر میں صدرِ مشاعرہ کی باری آئی تو انہوں نے اپنے کل کے بیان کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بنیادی طور پر رومانی شاعر ہوں عشقیہ شاعری ہی اصل شاعری ہے۔ اور اس تمہید کے بعد اپنے مخصوص ترنم میں اپنے عنفوانِ شباب کی غزل پڑھی ـــ

محبت میں ہم نے جوانی مٹا دی
جوانی تو کیا زندگانی مٹا دی

ایک کانفرنس کے دو مشاعروں میں تصویر کے دو رُخ دیکھ کر

تعجب ہوا اور افسوس کہ انسان کو مصلحت کے آگے کتنا مجبور ہونا پڑتا ہے۔
یہ عجب اتفاق ہے کہ آزادی کے بعد اردو تعلیم تو زوال پزیر ہوئی مگر مشاعروں کو عروج حاصل ہوا۔ اور ملک کے بڑے بڑے شہروں میں "بڑے بجٹ" کے مشاعرے ہونے لگے۔ مشاعروں کی روایت کو بھی قومی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مشاعرہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو پہلے جشن جمہوریت کے موقع پر دہلی کے تاریخی لال قلعہ میں منعقد ہوا اور تقریباً ایک صدی بعد پھر روحِ ظفر جاگی۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بہ نفسِ نفیس اس مشاعرے میں شرکت کی اور افتتاحیہ تقریر فرمائی۔ اس سے اُردو کی عظمت اور اُردو مشاعرے کے قومی کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
اس مشاعرے کے روحِ رواں تھے کنور مہندر سنگھ بیدی اور ساحر ہوشیار پوری۔ اس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے کونے کونے سے شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ اور کوشش کی گئی تھی کہ ہر طبقۂ خیال کی نمایندگی ہو سکے بمبئی سے مجھے دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ نوح ناروی، جوش ملسیانی، منور لکھنوی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراق، روش، مجاز، جذبی، بسمل، سعیدی، مخمور دہلوی ـــــ سبھی موجود تھے (نام گنانا مقصود نہیں ہے) شاعرات میں سیدہ اختر حیدرآبادی کو اسی مشاعرے میں دیکھا جو جگر صاحب اور کئی اور دوسرے شاعروں کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھیں۔ اور شاہدہ نکہت صاحبہ بھی شریکِ بزم تھیں۔
اگرچہ یہ مشاعرہ جشن جمہوریت کے موقع پر ہوا تھا۔ مگر موضوع کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ اکثر شعرا نے غزلیں ہی پڑھیں۔

یہ مشاعرہ رات کے بارہ بجے تک براہِ راست ریڈیو سے نشر ہوا تھا، لیکن شعرا کی تعداد اس قدر تھی کہ مشاعرہ ریلے پروگرام کے بعد بھی رات گئے تک چلتا رہا مگر مکمل نظم و ضبط کے ساتھ۔

نقشِ اول اتنا خوبصورت تھا کہ یہ مشاعرہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، مگر نقشِ ثانی — !! — یہ سالانہ مشاعرہ اب بھی ہوتا ہے مگر اس کا روپ رنگ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ بعض دفعہ تو پورا مشاعرہ ہڑبونگ کی نذر ہو جاتا ہے۔

دہلی میں رہ کر معلوم ہوا کہ اب مشاعروں کی یہی روش ہے۔ مشاعروں کے شعرا اور ہیں اور ادبی رسائل میں چھپنے والے شعرا اور — ایسے شعرا بہت کم ہیں جن کو مشاعروں اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہو۔ ادب کے اس انحطاط پر جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں — "واہ! واہ" کی خاطر بہت سے اچھے اچھے شعرا بھی مشاعرہ میں اپنا معمولی کلام سناتے ہیں۔ اور یہ "بے داد" راہِ راست پر چلنے والوں کو بھی گمراہ کر دیتی ہے۔

۱۹۶۴ء کی بات ہے، ندا فاضلی گوالیار کے ایک مشاعرے میں مجھے مخمور سعیدی اور دہلی کے کمیؔ اور شعرا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ کالج کا مشاعرہ تھا۔ میری صدارت کا اعلان کر دیا گیا۔ میرے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا کیونکہ سنا تھا کہ اس سے پہلے کالج کا مشاعرہ ہڑبونگ کی نذر ہو چکا تھا۔ ابتدا میں میں نے ادب کی نئی قدروں کا ذکر کیا۔ اردو شاعری کے نئے رنگ و آہنگ اور نئے شعری تجربوں پر روشنی ڈالی اور اپنی ایک دو جدید نظمیں سنائیں — کالج کے طلبا پر ان نظموں کا جادو چل گیا۔ مجمع میں زیادہ تعداد ہندی داں طلبا کی تھی۔ عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا

ہے کہ اردو شاعری گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ساقی و پیمانہ سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ لیکن جب انھوں نے اردو شاعری کے جدید آہنگ کو سنا تو متوجہ ہو گئے۔ پھر تو ایسا ماحول بنا کہ ایاز جھانسوی اور مضطر اندوری جیسے ٹھیٹھ غزل گو شعرا نے بھی معیاری غزلوں کے ساتھ نظمیں سنائیں۔ اور مشاعرہ ہنسی مذاق اور ذہنی عیاشی کے بجائے صحیح معنوں میں مشاعرہ ہوا ___ مجھے اس مشاعرے میں اپنی آٹھ دس نظمیں سنانا پڑیں اور میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا کہ اگر سامعین کو سنجیدگی سے عمدہ اور تازہ کلام سنایا جائے تو وہ بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور صحیح لطف لیتے ہیں۔

موضوعاتی مشاعروں کی روایت تو اردو میں بہت پرانی ہے لیکن فی زمانہ کسی ایک ہی موضوع پر پورا مشاعرہ ہونا شعرا اور سامعین دونوں کے لیے سخت آزمائش کی بات ہے، لیکن ہم چند دوستوں نے اس کا کامیاب تجربہ کیا۔

تقریباً دس سال پہلے وزارت صحت کے زیر اہتمام خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ سری نگر میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پریم بھار دواج اس کے کنوینر تھے۔ میں اس کی مشاورتی کمیٹی میں شامل تھا۔ سب سے پہلے تو ہم نے اس مشاعرہ کو گروپ بندی سے بچایا اور کوشش کی کہ سب طرح کے شعرا کو نمائندگی مل سکے۔ کلاسیکل رنگ کی نمائندگی فراق صاحب کر رہے تھے تو ترقی پسند اسکول کی نمائندگی سردار جعفری، نظم و غزل کے مختلف اسالیب کے نمائندہ شعرا تھے کلیم عاجز، تاباں، آزاد، شاذ تمکنت اور بشیر بدر اور مزاحیہ رنگ کے نمائندہ تھے ہلال سیوہاروی، گیت کار تھے بیکل اتساہی

شاعرات میں ممتاز مرزا اور جمیلہ بانو وغیرہ تاثر کی اور رحامدی کشمیر کے رنگ و آہنگ کو پیش کر رہے تھے (ظاہر ہے یہ فہرست مکمل نہیں ہے)۔

ہم نے شعرائے کرام کے دعوت ناموں میں یہ شرط بھی لکھ دی تھی۔ کہ مشاعرہ میں صرف خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر تازہ ترین کلام پڑھیں اور اپنی غزل یا نظم کی نقل ہمیں مشاعرے سے دس پندرہ دن پہلے بھیج دیں تاکہ بہ شرط ضرورت ترمیم و تنسیخ کرائی جا سکے۔ اس شرط سے صرف فراق صاحب کو مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ باقی تمام شعرا نے موضوع پر اپنا کلام ہمیں پہلے سے بھیجا۔ تاباںؔ اور میں اسکریننگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ہم نے بعض شعرا سے ان کی نظموں پر نظر ثانی کر لینے کی درخواست کی۔ اور جن ایک دو شاعروں نے پرانا کلام بھیج دیا تھا ان سے تازہ کلام منگوایا۔ غرض دہلی سے سری نگر روانہ ہونے سے پہلے ہمارے فائل میں مشاعرے کا پورا مواد موجود تھا اور مختلف رنگ میں کہنے والے شعرا نے خاندانی منصوبہ بندی جیسے خشک موضوع پر نئے نئے زاویوں سے نظمیں کہی تھی۔

یہ موضوعاتی مشاعرہ ہم لوگوں کی توقع کے مطابق بہت کامیاب ثابت ہوا ظاہر ہے اس کامیابی میں سب سے زیادہ دخل اس بات کا تھا کہ ہم نے شعرا سے تازہ کلام کہلوا لیا تھا اور ہر طرح پیش بندی کر لی تھی کہ کوئی بھی شاعر موضوع سے ہٹ کر اور پرانا کلام نہ سنائے کیونکہ اگر کسی ایک کے ساتھ بھی رعایت کی جاتی تو پھر یہ بند ٹوٹ جاتا اور ہمارا مقصد فوت ہو جاتا۔

دوسرے دن "کھلا مشاعرہ" ہوا مگر وہ بات نہ آئی کیونکہ شعرائے کرام نے حسب معمول اپنی پرانی "ہٹ" چیزیں سنائیں جن میں سے کئی

کثرتِ استعمال سے "پِٹ" گئیں۔

میرا خیال ہے کہ مشاعروں کو آج بھی ادب وشعر کی ترویج اور اہم مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے غیر جانبداری ادبی سوجھ بوجھ اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود مشاعرے عوام تک پہونچنے کا ایک موثر ذریعہ ہیں اور ان میں ادبی ذوق اور سماجی شعور فراواں کر سکتے ہیں۔ بس ضرورت ہے تو اس بات کی کہ مشاعرے کو تشاعروں اور خالص کاروباری ذہنیت رکھنے والے کنوینروں سے بچایا جائے جو دو پیسے بٹورنے کے لیے کبھی مشاعرہ کراتے ہیں تو کبھی قوالی۔ ان کے نزدیک دونوں چیزوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔

لینن کے دیار میں

وہ ۹ر جون [illegible]ء کی چمکدار صبح تھی جب ہم لوگ پالم ایرپورٹ دلّی سے ماسکو کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر کی زیادہ خوشی اس لیے تھی کہ میں تنہا نہیں جا رہا تھا بلکہ ۲۹۔ افراد پر مشتمل ایک ڈیلی گیشن کے ممبر کی حیثیت سے سوویت یونین جا رہا تھا جس کی رہنمائی ہندوستان کے سابق وزیر تعلیم اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شری مالی کر رہے تھے ملک کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے دانشور، مدبر اور مفکرایں قافلہ شوق میں شامل تھے۔ انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام یہ ڈیلی گیشن ان جذبات، رفاقت اور دوستی کے رشتوں کو لے کر سوویت یونین جا رہا تھا جو ہندوستانی عوام کے دلوں میں سوویت عوام کے لیے ہیں۔ اپنے ان دوستوں کے لیے جنھوں نے مشکل میں ہمارا ساتھ دیا اور وعدہ وفا کیا۔ اس وقت ہمارے ہاتھ مضبوط کیے جب لوگ کہتے تھے کہ ہمارا کوئی دوست نہیں۔ اس وقت ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے جب سامراجی ہماری راہیں مسدود کر دینا

چاہتے تھے۔

ہم لوگوں کے دل محبت اور خلوص سے مامور تھے۔ اس قافلۂ شوق میں اگر بی۔پی۔موریہ، راجہ رام شاستری، ڈی۔پی۔سنگھ، بی۔بھگوتی، ڈی۔سی گوسوامی اور ڈاکٹر ڈی۔پی۔دت جیسے ممبران پارلیمنٹ شامل تھے۔ نوشری جسونت سنگھ (سابق وزیر صحت و زراعت ہریانہ) ٹی۔انجیا (ایم۔ایل۔اے) سابق وزیر محنت آندھرا پردیش۔ (جو بعد میں مرکزی وزیر اور آندھرا پردیش کے چیف منسٹر بھی رہے) دُلال کھو ٹا، ایم۔ایل۔اے آسام، زینب بیگم ایم۔ایل۔اے۔جموں و کشمیر، اور شری گووند ریڈی سابق ممبر پارلیمنٹ بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ پھر مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سندر ویلو راجستھان یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔سی۔مہروترا، اور مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ ۔ مثلاً پٹنہ یونیورسٹی کے ایس۔کے۔بوس، جادو پور یونیورسٹی کلکتہ سے پروفیسر کلیان دت، پنجاب یونیورسٹی سے پروفیسر جی۔ ایس۔کھوسلہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر مونس رضا، دلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر کرتا رسنگھ، حیدرآباد سے پی۔سدرشن اور انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی کی مختلف شاخوں کے نمائندے۔ سگتا رے (مغربی بنگال۔ جو جنتا سرکار میں مرکزی وزیر رہے) دنیش پرساد سنگھ (بہار) رمیش سنہا (یو۔پی) ایس۔بشریا اور ابو بکر (کیرل) ہمارے ہم قدم تھے۔ اور اس ڈیلی گیشن کی روح رواں تھیں۔ "اسکس" کی جنرل سیکریٹری شریمتی لٹو گھوش۔ یہ ڈیلی گیشن اپنی طرز کا واحد ڈیلی گیشن تھا جس میں عوامی زندگی کے مختلف اور اہم شعبوں کے نمائندے جمع کر لیے گئے تھے اور اس تنوع اور رنگا رنگی میں ہندوستان کی قومی یک جہتی کی روح کارفرما تھی اور واضح کرتی تھی کہ آج

ہندوستانی عوام کے دلوں میں سوویت یونین کے عوام کے لیے محبتوں اور رفاقتوں کا جوش موجزن ہے اور اپنے اپنے طرز زندگی پر قائم رہنے کے باوجود انسان دوستی، امنِ عالم، سامراج دشمنی، اور نو آبادیاتی نظام کی مخالفت وہ مشترک قدریں ہیں جو باہمی دوستی کی پختہ بنیادیں ہیں۔ ہم لوگوں کو اسی موضوع پر ماسکو میں ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔

ہمارا جہاز — "ایروفلوٹ کا طیارہ — ایشیائی سبزہ زاروں، پہاڑوں اور ریگستانوں کو عبور کرتا ہوا اور بحرِ اخضر کے پانی پر پرواز کرتا ہوا چھ ساڑھے چھ گھنٹے میں ہی ماسکو پہونچ گیا اور سرزمین ماسکو پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اس شہر کے اونچے میناروں، بل کھاتے دریاؤں بلند عمارتوں اور ہرے بھرے درختوں نے ہماری نظروں کو محوِ تماشا کر دیا۔

میں چونکہ پہلی ہی بار سوویت یونین آیا تھا اس لیے قدرتی طور پر میری محویت زیادہ تھی۔ نہایت شاعرانہ فضا تھی۔ چمکیلی دھوپ اور لطیف خنکی ماسکو ایرپورٹ پر سوویت انڈین کلچرل سوسائٹی کے صدر اور سوویت یونین کے کے وزیر کامریڈ این۔ وی۔ گولڈن نے ہمارا پر جوش اور شاندار استقبال کیا اور فضا دوستی اور باہمی محبت کے جذبات سے معمور ہو گئی — کامریڈ گولڈن ہندوستان رہ چکے ہیں اور بھلائی اسٹیل پلانٹ ان کی سرکردگی میں ہی بنا ہے جو ہند و سوویت دوستی کا ایک درخشاں نمونہ ہے۔ اسلیے انھیں ہندوستان سے بے پناہ محبت ہے اور اسے اپنا دوسرا گھر تصور کرتے ہیں۔

ماسکو ٹائم ہندوستان کے وقت سے تقریباً تین گھنٹے پیچھے ہے اس لیے وہاں خوب دھوپ کھلی ہوئی تھی اور ہم لوگ جب ایرپورٹ سے

اپنی قیام گاہ رسیا ہوٹل روانہ ہوئے تو ہمارے رہبر کا مریڈ زڑنن نے شہر کی سڑکوں اور مقامات کے بارے میں بے تکان تقریر شروع کر دی ہمارے ساتھ کامریڈ چیلی شیف بھی تھے جو سوویت یونین میں ہندی زبان کے عالم ہیں اور کئی بار ہندوستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ہمیں بتلاتے رہے۔

ہم اس سڑک سے گذرے جس سے کبھی نازی فوجیں ماسکو میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ اس سڑک نے فاشزم کے مظالم اور درندگی کی یاد تازہ کر دی اور ساتھ ہی سوویت عوام کے لیے دل میں عقیدت کا طوفان اٹھا۔ جنہوں نے کمال جانبازی سے نازی فوجوں کا مقابلہ کیا اور ان کو ماسکو شہر میں گھسنے سے پہلے ہی پیچھے دھکیل دیا جس مقام سے نازی فوجوں کی پسپائی شروع ہوئی تھی وہاں ایک آہنی یادگار قائم ہے کہ کس انداز سے نازی ٹینکوں کو روکا گیا تھا۔ اور ہم شہر کی سب سے لمبی سڑک لینن گراڈ سے گزرتے ہوئے وسط شہر میں آگئے۔ مایئکا وسکی کا مجسمہ راستے میں دیکھا۔ جی ہاں وہی مایئکا وسکی جس کی نظمیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی تھیں۔

شہر ماسکو اپنی پوری آب و تاب اور رونق کے ساتھ جاگ رہا تھا مگر بھیڑ بھڑکا، دھکم دھکا کہیں نہیں۔ نہ لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار۔ نہ یہ اضطراب کہ کسی کو دھکا دے کر آگے بڑھ جائیں۔ اطمینان بخش نظم و ضبط ہر جگہ نظر آیا۔ کاریں، اسکوٹر، اور موٹر سائیکلیں بغیر ہارن کے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں۔ نہ شور، نہ ہنگامہ لوگ سینما گھروں، تھیٹروں اور تفریح گاہوں کے دروازوں پر لمبی لمبی قطاروں میں لگے ہوئے نظر آئے۔ مگر مطمئن۔ ایک جاذب نظر نظارہ تھا ماسکو میں ہر جگہ سبزہ زاریں شہر کے ایک تہائی حصے

یں درخت ہیں جنہیں باقاعدہ اگایا گیا ہے۔ ماسکو والوں نے یہ "منگل میں جنگل"
اس لیے کیا ہے کہ سردی کے موسم میں برفانی ہواؤں کے طوفانوں کی شدت
کم ہو ان درختوں اور سبزہ زاروں سے ماسکو کی خوبصورتی میں چار چاند
لگ گئے ہیں۔

اس شہر کی جھلک دیکھتے ہوئے ہم اپنی قیام گاہ رسیا ہوٹل پہونچ گئے۔
جدید طرز کا بہت بڑا اور شاندار ہوٹل نیچے دریائے ماسکو بہتا ہے۔ اس دریا
کو سوویت انجینئروں نے اس طرح اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق ڈھالا ہے
کہ یہ اب محض ایک دریا نہیں ہے کہ بلکہ سمندر کا نعم البدل معلوم ہوتا ہے اور
اس قدر گہرا کر دیا گیا ہے کہ دخانی جہاز بہت آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ اور لکڑی
کے بڑے بڑے لٹھے اور دیگر سامان ان دخانی جہازوں میں لاد کر براہ ماسکوا
والگا پہونچتا ہے جسے والگا کی لہریں بحرۂ اسود کی بندرگاہ پر لے جاتی ہیں۔
سنیچر اور اتوار کو سوویت یونین میں چھٹی منائی جاتی ہے۔ ہم سنیچر کو ہی
ماسکو پہونچے تھے اور دن پُر بہار تھا اس لیے ہم باوجود تکان کے سیر کو نکل کھڑے
ہوئے۔ لوگ ہر جگہ شاداں و فرحاں نظر آئے اور ہم ہندوستانیوں کو دیکھ
کر ان کی آنکھوں میں دوستی اور رفاقت کی جو چمک آتی تھی اسے لفظوں میں
بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہند
سوویت دوستی کے سرچشمے انہیں آنکھوں سے پھوٹتے ہیں جن میں سادگی اور
بے لوث محبت موجزن ہے۔

۱۰ر جون کی خوشگوار اور فرحت بخش دھوپ میں جب ہم اپنے ہوٹل سے
نکلے تو ماسکو کی رونق کل سے زیادہ تھی اور اتوار کی چھٹی منانے کے لیے لوگ
اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے ہوٹل کے قریب ہی کریملن

تھا۔ ماسکو کا لال چوک جہاں انقلاب کی سالگرہ پر پریڈ ہوتی ہے۔ جہاں کریملن کی تاریخی عمارت واقع ہے جس کے میناروں پر سرخ ستارے سوویت نظام کی سرخروئی کا اعلان کرتے ہیں۔ کریملن سوویت یونین کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ یہاں لینن محو خواب ہے اور یہیں سپریم سوویت کا مرکز بھی ہے یعنی کریملن انقلاب روس کے شاندار ماضی کا بھی امین ہے اور درخشاں حال اور خوش آیند مستقبل کا مرکز بھی۔ کریملن کے فیصلوں پر دنیا کی نگاہ ہوتی ہے کریملن کی آواز میں دنیا کے امن پسندوں انسانیت کے محافظ لوگوں کی آواز شامل ہوتی ہے۔ جب ہمارا وفد لینن کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے بڑھا تو ہم نے دیکھا کہ انقلاب کے اس عظیم رہنما کو خراج پیش کرنے کے لیے لوگ کئی فرلانگ تک قطار در قطار موجود ہیں اور قدم قدم بڑھ رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر اطمینان اور آنکھوں میں عقیدت کی جھلک موجود تھی۔

پھولوں کا بڑا گلدستہ مزار کی دیوار کے پاس رکھ کر ہم لوگ اندر پہونچے وہ جگہ جہاں لینن محو خواب ہے مگر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں یہ سوویت ٹکنالوجی کا کمال ہے کہ لینن کے جسد خاکی کو جوں کا توں ممی بنا کر حفاظت سے رکھا ہے۔ اسے سپرد خاک نہیں کیا ہے۔ ے

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اور اس دیدہ ور کو موت کے بعد بھی اس کے دیوانوں نے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ اور تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لینن ابھی اٹھ کر کام کرنے لگے گا۔

لینن کا جسد خاکی میرے سامنے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کی روح زندہ ہے نہ صرف سوویت عوام کے دلوں میں بلکہ دنیا کے ان تمام

انسانوں کے دلوں میں جو جبر و استحصال کے خلاف جد وجہد کر رہے ہیں امن عالم کے قیام کے لیے کوشاں ہیں اور اس دنیا کو حسین تر بنانے کی جد وجہد میں مصروف ہیں۔ لینن کی زندگی اور اس کے مرصع کارنامے آج دنیا کی ترقی پسند تہذیب کا ایک حصہ ہیں جو تمام انسانوں کی میراث ہے۔ لینن نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے زار شاہی سے عنانِ حکومت چھین کر سوویت عوام کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس پرامن انقلاب کے رشتے ہر اس انقلاب سے ملتے ہیں۔ جو عدم تشدد کے ذریعہ لایا جائے اور اسی لیے سوویت عوام کا امن وسلامتی پر اعتقاد ہے اور آج عالمی ایوان سیاست میں وہ جنگ کے لیے نہیں۔ قیام امن کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور امن پسند قوموں سے ربط ضبط ان کے قومی مزاج کا لازمی جزو ہے۔ اس پس منظر میں ہندوستان اور سوویت یونین کی باہمی دوستی کی روشن تصویر میرے ذہن میں اور واضح ہو گئی۔

مزارِ لینن پر پھول چڑھا کر اور اس احاطہ میں دیگر مقتدر لوگوں کی قبور کی تختیاں دیکھتے ہوئے جب میری نظر دنیا کے پہلے خلا باز یوری گگارن کے نام پر گئی تو میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ جب یہ خوبصورت خلا باز ہندوستان آیا تھا تو میں نے اس کا استقبال کرتے ہوئے ایک نظم میں کہا تھا ؂

تو وہ مسافرِ شب ہے کہ جس کے نقشِ قدم
سحر کی منزلِ رنگیں کی دے رہے ہیں خبر
نہ جانے کونسی منزل ہے دورِ حاضر کی
جو کہکشاں کو بنایا ہے تو نے گردِ سفر

اور آج وہ اپنی منزلوں کی تلاش میں منزلِ وجود سے گذر کر بہت آگے نکل گیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے نقشِ قدم چھوڑ گیا ہے۔

مزار لینن کے احاطہ سے نکل کر ہم لوگ گمنام شہیدوں کے مزار پر پھول چڑھانے گئے۔ وہاں کبھی نہ بجھنے والی مشعل روشن تھی۔ ایسے لوگوں کی یاد میں جو نام ونمود سے بے نیاز مادرِ وطن کی محبت اور انسانیت کے تحفظ کی خاطر تیر و تفنگ سے کھیلتے ہوئے سرخرو ہو کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے جاودان نقش دنیا کے عوام کے لیے چھوڑ گئے۔ شجاعت کی یہ مشعل ہر اس شخص کو درسِ عمل دیتی رہے گی جس کے دل میں مادر وطن کی محبت اور جذبۂ ایثار ہے۔

ماسکو شہر، شہر تماشا ہے۔ جنت نگاہ ہے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے۔ سوویت عوام نے اپنے ماضی کے ورثہ کو محفوظ رکھا ہے جب ہم اس میوزیم میں پہونچے جہاں زار شاہی کے کر و فر کی جھلکیاں ملتی ہیں تو نگاہ محو حیرت ہو گئی —— ہر چیز پر سونا لدا ہوا۔ اس میوزیم میں جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ اب جو نقش میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ شاہانِ زار کو گھوڑوں سے بہت عشق تھا اور گھوڑوں کے ساز و سامان اس قدر پر تکلف اور قیمتی ہیں کہ اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ اور قوی ہیکل گھوڑوں کے مجسمے اور وہ طرح طرح کی بگیاں اور گاڑیاں جو ان شہنشاہوں کی سواری میں رہتی تھیں اپنی مثال آپ ہیں اور نوادراتِ عالم میں سے ہیں۔ تاریخ کے طالب علموں کے مطالعہ کے لیے یہ چیزیں اہم مواد فراہم کرتی ہیں۔ اور پیٹر اعظیم کا شاندار مجسمہ جو غیر معمولی حد تک طویل قامت تھا۔ آج بھی سوویت عوام سے خراج عقیدت حاصل کرتا ہے۔ اس کے جوتوں، لباس اور اسلحہ وغیرہ کی نمائش بڑے اہتمام سے کی گئی ہے اس میوزیم میں۔ مگر میرے نزدیک ان چیزوں کا مطالعہ اس لیے باعثِ دلچسپی ہے کہ اس قدر عظیم شہنشاہی نظام کا تختہ مروڑ کر عوامی قوت ابھری اور سوویت دیس کے مزدوروں، کسانوں اور

عوام کے نمائندوں کی حکومت قائم ہوئی۔ کل تک جو شہنشاہ عوام کے لیے درندہ صفت تھے آج محض شیر قالین ہیں اور تماشائے عبرت ہیں۔ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ آگیا مگر نقشِ کہن اس لیے نہیں مٹایا گیا کہ تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا جاسکے۔

ہمارے کلچرل وفد کا بنیادی مقصد سوویت انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سمپوزیم میں شرکت کرنا تھا جس میں ہند و سوویت دوستی کے گوناگوں پہلوؤں پر غور و خوض اور تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ ہمارے علاوہ اس سمپوزیم میں شرکت کرنے والے سوویت یونین کے تقریباً ستر نمائندے تھے۔ ۱۱ سے ۱۸ جون تک یہ سمپوزیم چلا اور ہاؤس آف فرینڈ شپ کی فضا ہند و سوویت دوستی کے ماحول سے منور اور خوشگوار تر ہوتی چلی گئی۔ کلچرل اور فرینڈ شپ سوسائٹیوں کی پریسیڈیم کے صدر کامریڈ این۔ وی۔ پوپوف نے افتتاحیہ تقریر کی۔ کامریڈ این۔ ڈی۔ گولڈن نے استقبال کیا۔ اور کھلے دل سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ ہندوستان اور سوویت یونین کی دوستی برابری اور باہمی رواداری کی بنیادوں پر ہے یہ دوستی باہمی مفاد پر قائم ہے اور اس سے ایشیا میں امن کے رشتے اور مضبوط ہوئے ہیں اور ترقی پسند قوتوں کا پرچم اور بلند ہوا ہے۔

اس سمپوزیم میں سوویت یونین کے ماہرین نے وزرائے حکومت نے دانشوروں اور مدیروں نے ذوق و شوق سے شرکت کی اور باہمی گفتگو سے ذہنی دھندلکوں کو دور کیا گیا۔ اس حقیقت کے پہلو اور روشن تر ہو کر سامنے آئے کہ ہند و سوویت معاہدۂ امن و دوستی و تعاون ایک نئی قوت بن چکا ہے اور دونوں ملکوں کی دوستی کے رشتے پائیدار ہو چکے ہیں اگر ایک

طرف اقتصادی تعاون بڑھا ہے تو دوسری طرف ثقافت سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں بھی پیش رفت ہوئی ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ دونوں ملکوں کو قریب تر لانے میں کلچرل سوسائیٹوں نے اہم رول ادا کیا ہے اور دوستی اور رواداری کے پیغام کو گھر گھر پہونچایا ہے۔ بکارو اور بھلائی کے فولادی کارخانے اگر ہند دوستی کی ایک مثال ہیں تو دوسری طرف انڈو پاک جنگ کے موقعہ پر سوویت یونین کا کھلے دل سے ہندوستان کی مدد کرنا تاقابلِ فراموش تاریخی واقعہ ہے۔ آج دونوں ملکوں کی حکومتیں اور عوام ایک دوسرے کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں۔ دلوں کی دھڑکنوں کی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں اور یہ دوستی برِ بنائے مصلحت نہیں، بلکہ اصولوں اور آدرشوں کی بنیاد پر استوار ہے۔ میں نے اس سمپوزیم کی فضا سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی "وا لگا اور گنگا" یہ نظم میں نے آخری اجلاس میں پڑھی جس کا روسی میں ترجمہ تاشقند کے پروفیسر مرزوف نے کیا تھا۔ نظم بیحد مقبول ہوئی۔ اسی کے آخری شعر یہ ہیں ؎

شاعرو، مطربو، اور صورت گرو
آؤ کلچر کے معمارو! آگے بڑھو
گورکی اور ٹیگور کے ساز پر
رقص کرتے چلو، گیت گاتے چلو
رقص کی لے بڑھے رقص کی لے بڑھے
تیز تر، تیز تر، تیز تر، تیز تر
کرۂ ارض ہے اپنی آغوش میں
فاصلے ہو گئے کس قدر مختصر
رقص کی لے بڑھے۔

تیز تر ـــ

تیز تر ۔

مجموعی طور پر یہ سمپوزیم ہند سوویت دوستی کی راہ میں ایک روشن سنگ میل ثابت ہوا کھل کر بحثیں بھی ہوئیں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو واضح طور پر سمجھا گیا اور باہمی رشتوں اور رفاقتوں کے نئے امکانات تلاش کئے گئے۔

ماسکو میں ہمیں کئی فیکٹریوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اور ان کی کارکردگی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہر فیکٹری میں ورکروں کو انتظامیہ میں نمائندگی حاصل ہے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین کے نمائندے فیکٹری کے منیجر کے ساتھ کام کرتے ہیں اور نزاعی مسائل پیدا ہونے سے پہلے ہی معاملات کو گفت و شنید کے ذریعہ سلجھا لیا جاتا ہے۔ اور ہڑتال کی نوبت نہیں آتی۔ اس تعاون کا مال کی تیاری پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور فیکٹری کی ترقی سب کی ترقی تصور کی جاتی ہے کیونکہ ورکروں کو بونس ملتا ہے۔ عام ورکر اور جنرل منیجر کو جو تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں بہت زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ورکر کو ڈیڑھ دو سو روبل ملتے ہیں تو جنرل منیجر کو ساڑھے تین چار سو۔ ہم جہاں جہاں گئے۔ تمام فیکٹریوں میں جدید مشینوں پہ کام ہوتا ہوا دیکھا اور ہر جگہ یہ بات دیکھنے میں آئی کہ کام زیادہ ہے اور آدمیوں کی کمی ہے۔ عام طور پر فیکٹری ورکروں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور کہیں کہیں تو نوے اور پچانوے فی صدی عورتوں کام کرتی ہیں۔

سوویت یونین میں ہندوستان سے دوستی ایک رجحان کی صورت اختیار کر گئی ہے اور بہت سی فیکٹریوں میں سوویت انڈین کلچرل سوسائٹی کی اجتماعی ممبرشپ ہے۔ مثلاً ماسکو میں کلا رازیکن فیکٹری یا قار شینو

فیکٹریوں میں انتظامیہ اور ورکروں کے تعلقات انتہائی خوشگوار ہیں۔ دراصل سوویت یونین میں مل اور فیکٹریاں بہت بڑے بڑے پیمانوں پر ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی تفریح گاہیں ہیں۔ اور اپنے اسکول، اپنے ہسپتال، اپنے تھیٹر، اپنی لائبریریاں، اور بچوں کے لیے پاینیر کیمپ ہیں۔ پاینیر کیمپ، بچوں کی جنتیں ہیں۔ وہاں بچے اپنی مرضی کے مطابق چھٹیاں گزارتے ہیں اور انہیں اپنی شخصیت کی آزادانہ تعمیر کا موقع ملتا ہے۔

ماسکو میں تفریح گاہوں اور کھیل تماشوں کی کمی نہیں روزانہ لنچ کے بعد ہمارا وقت یا تو قابل دید مقامات کی سیر میں گزرا یا کلچرل پروگراموں میں۔ ایک نمائش گاہ تو مستقل ہے۔ بارہ مہینے نمائش لگی رہتی ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک شہر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے وہاں کے خلائی پرواز کے پویلین کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔ "دلیونوخود" کس طرح چاند کی سطح پر کام کرتا ہے اس کی تفصیل۔ خلائی جہازوں کے ہوبہو نمونے وہاں گگارن کا پیراشوٹ بھی دیکھا جس کے ذریعہ وہ پرواز کے بعد زمین پر اترا تھا۔ اس خلائی جہاز کے کچھ حصے بھی دیکھے جسے پرواز کے دوران حادثہ پیش آگیا تھا۔ اس پویلین کو دیکھنے کے بعد جہاں سوویت یونین کی ایٹمی قوت میں ترقی کا نقش دل پر ثبت ہوتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی ذہن نشین ہوتی ہے کہ اس عظیم قوت کو جنگ کے لیے نہیں، امن کے استحکام کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے نسل انسان کی تباہی کے لیے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی تعمیر کو اور توانا بنانے کے لیے مصرف میں لایا جا رہا ہے۔ اور اسی میں سوویت یونین کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یوں تو فیکٹریوں اور پاینیر کیمپوں میں بھی ہمیں کلچرل پروگرام دیکھنے کے

مواقع ملے مگر ماسکو کا عظیم بالشو ویک تھیٹر دیکھ کر تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس قدر مکمل اسٹیج ٹیکنیک، لائٹنگ کا بیحد عمدہ انتظام، اور اسٹیج پر دنیا کا مشہور بیلے، سوویت رقص کا کمال دیکھ کر بے اختیار مرزا غالب یاد آگئے ؎

نغیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

بالشو ویک تھیٹر کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگوں کو ایک ایک سال ٹکٹ کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سرکس میں کلاکاروں نے خلائی پرواز کے منظر کو اپنی قلا بازیوں اور جلتی بجھتی روشنیوں کے چاند ستاروں کے ماحول میں جس خوبصورتی سے پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ہندوسوویت دوستی کے اس سمپوزیم کے دنوں ماسکو میں ہندوستان کی عوامی زندگی سے متعلق سوویت آرٹسٹوں کی پینٹنگس کی نمائش کا بھی افتتاح کیا گیا۔ ان آرٹسٹوں نے بڑی گہری نظر سے ہندوستان کے مناظر یہاں کے دیہات، یہاں کے عورتوں اور ان کے رنگا رنگ لباسوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ماسکو کے فرینڈشپ ہاؤس میں تازہ تصویروں کی یہ نمائش دیکھ کر ہندوستان کی بے حد یاد آئی اور ساتھ ہی دل اس جذبے سے سرشار ہوا کہ ہماری زندگی نے سوویت آرٹسٹوں کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اپنے فن کو اس کی محبت میں صرف کر دیا، نہایت سادہ، سچی اور بامعنی تصویریں تھیں وہ۔

ثقافت کے مختلف شعبوں میں سوویت فنکار ہندوستان سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً راماین کا روسی زبان میں ترجمہ کرکے گذشتہ ۱۵ سال سے اسے اسٹیج پر پیش کیا جارہا ہے۔ شری رام چندر جی کا

کردار ادا کرنے والے کلاکار اور راماین کو روسی زبان میں منتقل کرنے
والی مصنفہ ہمارے سمپوزیم میں تھیں اور ان کی باتوں سے ہندوستان کی محبت
پھوٹی پڑتی تھی۔ کامریڈ چیلی شیف نے ہمیں وہ ہوٹل دکھلایا جہاں ٹیگور ٹھہرے
تھے۔ ٹیگور کے ڈراموں کو وہاں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ
کے سربراہ بابا غفور روف سے مل کر اندازہ ہوا کہ اس یکتائے روزگار شخص
کو ہندوستان اور اس کی تہذیبی قدروں سے کتنی محبت ہے اور یہ علمی سطح
پر کام کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہند و سوویت دوستی کا ماحول اس قدر خوشگوار
ہے۔ آج سوویت یونین کے غیر ملکی طالب علموں میں ایک خاص تعداد ہندوستانی
طلبا اور طالبات کی ہے۔ اور ہندوستانی طلبا کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا ہے۔
سوویت یونین میں بے مہار تعلیم اور بے مقصد ڈگریاں پانے کا دستور
نہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں مقابلہ کا امتحان پاس کر کے ہی داخلہ ملتا ہے۔
اور پورے ملک میں کسی مخصوص کورس کے لیے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت
داخلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا امکان ہی نہیں ہوتا کہ اگر ایک میڈیکل
کالج میں داخلہ نہ ملا تو کسی اور شہر یا علاقے کے دوسرے میڈیکل کالج میں داخلہ
مل گیا۔ تعلیمی منصوبے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ملک کی ضروریات کے اعتبار سے
ہی ڈگری کورس، ریسرچ کے موضوعات اور طالب علموں کی تعداد طے کی جاتی ہے
اس لیے بیکار گریجویٹوں کا تصور ہی نہیں ہے۔ بلکہ ڈگری کورس پورا کرنے سے
پہلے ہی ملازمتوں کی پیش کش ہونے لگتی ہے۔ اس عمدہ تعلیمی نظام کی وجہ سے
طالب علموں میں ہلچل، بے اطمینانی، مستقبل سے مایوسی اور اپنے ماحول سے
بغاوت کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا اور خلاقانہ ذہنوں کے دھارے تخلیق و تعمیر
کی طرف مڑ جاتے ہیں اس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں اس قدر ترقی

ممکن ہو سکی ہے۔

ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی ایک اعلیٰ اور بلند عمارت میں ہے اور اس کا ہر شعبہ اپنی جگہ ایک دنیا ہے۔ صرف فزکس ڈیپارٹمنٹ ہی کئی منزلوں میں ہے اور نوادرات کا عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ کا شعبہ قابل ذکر اور لائق ستائش ہے۔

ماسکو سے بیس پچیس میل دور گورکی نیسکی، نام کی ایک آبادی ہے۔ اس گاؤں میں واقع ایک مکان کو لینن کی آخری رہائش گاہ کہلانے کا فخر حاصل ہے بیماری کے آخری دو سال لینن نے یہیں گزارے۔ مگر آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں مفلوج ہونے کے باوجود اس دو منزلہ عمارت میں لینن نے اپنے اوپر چڑھنے کے لیے ایک خاص ریلنگ بنوائی تھی اور بغیر کسی سہارے کے روزانہ اپنے اسٹڈی روم میں اوپر جاتے تھے۔ صرف آخری دن نہیں جا سکے۔ اور وہ کیلنڈر جس کی تاریخ کا ایک صفحہ وہ روز پھاڑ دیتے تھے ۲۱ تاریخ کو اپنے سینے سے لگائے لینن کے ہاتھوں کے لمس کو آج تک یاد کر رہا ہے اور میز پر کاغذ رسائل، اخبار، قلم، دوات بدستور رکھے ہیں اور آج نمائش کی چیز بن گئے ہیں اس محل سے باہر ایک مجسمہ ہے جس میں عوام اپنے محبوب رہنما کی لاش کو کاندھے پر اٹھائے لے جاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ گورکی نیسکی میں لینن کے استعمال کی موٹریں اور چھوٹی کشتیاں بھی محفوظ ہیں۔ یہ سب کچھ لینن کی عملی اور ان تھک زندگی کی گواہی دے رہا ہے۔ اس مکان کے برآمدہ کے باہر وہ سفید بنچ اب تک موجود ہے جس پر لینن سستانے کے لیے آکر بیٹھتے تھے گورکی نیسکی کا سادہ اور بے تکلف گھریلو ماحول دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اس مکان کے مکین ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔

۹ر جون سے ۱۸ر جون تک دس دن جیسے پلک جھپکتے گذر گئے۔ سمپوزیم، سیر سپاٹے، کھیل تماشے، ملاقاتیں، بے تکان باتیں۔ اس شہر میں جن ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی وہ ایسے ٹوٹ کر ملے جیسے ہم برسوں کے ساتھی ہوں حالانکہ کچھ لوگوں سے تو پہلی ہی ملاقات تھی۔ لکھنؤ کے حبیب صاحب ماسکو میں رہتے ہوئے لکھنوی تہذیب و شائستگی کا مکمل نمونہ۔ سنتے ہی آئے اور ہم لوگوں سے اس طرح گلے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ پھر بنے بھائی کی بیٹی نسیم اور ان کے شوہر ونود بھاٹیہ۔ ان سے ہندوستان میں کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دونوں یہاں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے۔ بہت ٹوٹ کر ملے اتفاق کی بات ہے کہ بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) بھی ان دنوں ماسکو ہی میں تھے اور افرایشائی کانفرنس کی تیاری کے سلسلے میں آئے تھے۔ ان کے ساتھ فیض احمد فیض بھی تھے۔ ان سے تو ملاقات نہ ہو سکی مگر بنے بھائی بھاٹیہ کے گھر موجود تھے جب میں اور یونس رضا وہاں پہنچے۔ ماسکو میں بنے بھائی سے مل کر بہت لطف آیا۔ بہت خوش تھے۔ کھلے پڑتے تھے۔ اپنے مخصوص قسم کے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ نظمیں سنائیں۔ کہنے لگے۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے نجمہ کے پاس لندن جانا ہے۔ پھر الما آتا میں کانفرنس میں شرکت کرنے روس آؤں گا مگر ہم میں سے کسی کو بھی نہ معلوم تھا کہ وہ الما آتا تو ضرور آئیں گے۔ مگر اس کے بعد ..... یہ بنے بھائی سے آخری ملاقات تھی۔ وہ ہشاش بشاش تھے لندن گئے۔ پھر الما آتا بھی آئے مگر وہاں۔ وہ اچانک موت کی گرفت میں آگئے اور فیض احمد فیض الما آتا سے ان کی لاش ہندوستان لائے۔ وہی بنے بھائی جنہوں نے کئی نسلوں کو ترقی پسند نظریات سے آشنا کیا تھا۔

ماسکو میں طاہرہ اور ان کے شوہر ضیا الحسن سے ملاقات ہوئی۔ اشرف ملے

ایک شام طاہرہ نے میری اور یونس رضا کی دعوت کی ہندوستانی کھانے کھلائے۔ کیا لطف آیا ہے ماسکو میں دال چاول کھا کر ہم لوگ سب ماسکو میں بیٹھے آل انڈیا ریڈیو، دہلی اور خاص طور پر اردو مجلس کی باتیں کرتے رہے طاہرہ میرے ساتھ اردو مجلس میں کام کرتی تھیں۔ پھر اپنے صحافی شوہر کے ساتھ ماسکو چلی گئی تھیں جو وہاں پیٹریاٹ کے نمائندے تھے۔ اور اب وہ ماسکو ریڈیو پر اردو میں خبریں پڑھتی تھیں۔ طاہرہ نے میرے لیے ریڈیو پروگرام کا اہتمام کیا۔ میں نے خاص طور پر سوویت یونین میں تعلیم کے موضوع پر تقریر ریکارڈ کرائی جو ماسکو یونیورسٹی کے تاثرات پر مبنی تھی پھر اپنی نظم۔ 'وانگا اور گنگا' پڑھی۔ ماسکو ریڈیو پر ساجدہ اور زاہدہ کی بہن شاہدہ سے ملاقات ہوئی۔ اور روسی نژاد، لدملا۔ جو نہایت شستہ اردو بولتی ہیں اور وہاں کے اردو پروگراموں میں حصہ لیتی ہیں۔

غرض دس دن یوں گذر گئے کہ خبر ہی نہ ہوئی اور ۱۸ رجون کی رات کو جب یہ احساس ہوا کہ صبح ماسکو سے جانا ہے تو میں کچھ اداس ہو گیا۔ رسیا ہوٹل میں اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑا دیر تک خالی خالی نگاہوں سے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے شہر اور اس کے بلند میناروں کو دیکھتا رہا۔ قریب اس گرجا گھر پر بار بار نظر ٹھہر جاتی جو آثار قدیمہ کا خوبصورت نمونہ ہے ہے۔ اور جس کے خوش وضع مگر چھوٹے بڑے گنبدوں کی رنگا رنگی نے اس عمارت کو فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ بنا دیا ہے۔ جدید عمارتوں کے باوجود ماسکو میں قرون وسطیٰ کے گنبد بہت نظر آئے ہیں۔ میں دیر تک دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس روشنیوں کے شہر کو۔ دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اور تاثرات اشعار بن گئے ہے

روشنیاں ہی روشنیاں

دور نگاہوں کی منزل تک روشنیاں ہی روشنیاں

اونچے میناروں کے سروں پہ تاج سجاتی روشنیاں

منظر کی پیاس آنکھوں کو ناچ نچاتی روشنیاں —

ماسکوا کی پھیلی باہوں میں لہراتی روشنیاں

یادوں کے دھندلائے چہروں کو چمکاتی روشنیاں

آنکھوں میں بیداری کے طوفان جگاتی روشنیاں

شاعر کے غم خانۂ دل میں دھوم مچاتی روشنیاں

دور خیالوں کے ساحل تک روشنیاں ہی روشنیاں

روشنیاں ہی روشنیاں

۱۹ر جون کو پرواز کر کے ماسکو سے ہم لینن گراد پہونچے تو اس شہر کو نگاہیں حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔ اس شہر کی ادا ہی کچھ اور ہے۔ یہ دل کا شہر ہے۔ دریائے نیوا اور اس کی جہاز بردار لہروں اور سیکڑوں خوبصورت پلوں کا شہر ہے۔ پل، جو رات کے دو بجے سے پانچ بجے تک اوپر اٹھ جاتے ہیں اور جہازوں کو اذن سفر دیدیتے ہیں۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس کی انفرادی شان نے دل کو مسحور کر لیا۔ اس کی آن بان اور شان وشوکت دیکھ کر یقین ہی نہیں ہوتا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی فوجوں نے اس شہر کو ۹۰۰ دن تک اپنے نرغہ میں رکھا تھا اور اس کے باشندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ مگر واہ رے لینن گراد کہ تیرے فرزندوں اور جگر پاروں نے تیری عزت وحرمت کے تحفظ میں ۱۰ ملین لوگوں کو قربان کر دیا اور آخر دشمن کو زیر کر کے سربلند ہوئے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں صف ماتم

نہ بچی ہو۔ یہ صرف اس صدی کی چوتھی دہائی کی بات ہے اور آج لینن گراد
کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شہر اس قدر شدید تباہی سے دوچار ہوا ہوگا
آج محسوس ہوتا ہے کہ اس سرسبز و شاداب شہر پر نہ کوئی بم گرا، نہ یہاں سے
درندگی کا قیامت خیز خونیں ناچ ہوا۔ اور نہ قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی
کیونکہ تمدن و ثقافت کے متوالوں نے تباہ شدہ عمارتوں کو پھر اسی قدیمی
شان اور آب و تاب کو باقی رکھتے ہوئے شہر کو دوبارہ کھڑا کر دیا ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ تباہی اور بربادی کے لرزہ خیز طوفان سے کھیلنے کے بعد لینن
گراد نہ صرف پرانا لینن گراد نظر آتا ہے۔ نہ صرف تاریخی عظمتوں کا مرکز دکھائی
دیتا ہے بلکہ جدید تعمیرات بھی اس طرح کی گئی ہیں کہ اس کی اپنی روایتی اور
تہذیبی آن بان اور چمک اٹھے۔

لینن گراد بار بار انقلاب سے گذرا ہے اور ہر بار خون میں غسل کر کے
اور سرخرو ہوا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے فاتح عالم بننے کا خواب دیکھنے
والے نپولین کو شکست دی تھی۔ باب فتح، لکڑی کا ہرے رنگ کا بلند
دروازہ، یاد دلاتا ہے کہ یہاں سے نپولین کی فوجوں کو آگے نہ بڑھنے
دیا گیا تھا۔ اور نازیوں کی شکست خوردگی کی یادگار بھی اسی طرح محفوظ ہے۔
تاریخ کے ورثہ کو لینن گراد نے سنبھال کر رکھا ہے۔ اور آج بھی پیٹر
اعظم کے مجسمے شہر میں کئی جگہ نصب ہیں کیونکہ پیٹر اعظم نے اپنے دور حکومت
میں ملک و قوم کی بھلائی کے کچھ ایسے کام کئے کہ اس زار شہنشاہ کو
روس کے لوگ آج تک نہیں بھولے۔ وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ ایک
فنکار بھی تھا اور علوم و فنون کا سرپرست بھی تھا۔ آج وہ عظیم تاریخ کا
ایک حصہ ہے۔

بازاروں اور سڑکوں پر لینن گراد کی عظمتوں کے نشانات دیکھتے ہوئے ہم لینن گراد ہوٹل پہونچے اور وہاں سے سب سے پہلے اس قبرستان میں عقیدت کے پھول چڑھانے گئے۔ جہاں نازیوں سے لوہا لینے والے لاکھوں سورما مدفون ہیں۔ اس وسیع اجتماعی قبرستان میں مادرِ وطن کا ایک بلند اور خوبصورت مجسمہ ہے۔ مادرِ وطن اپنے سپوتوں کو اپنی حفاظت کرنیوالے، شہیدوں کو گلہائے عقیدت پیش کر رہی ہے۔ اس قبرستان کو دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں اور دل بیتاب ہو گیا۔

کیا دوانوں نے موت پائی ہے

شہیدوں کو یاد کرنا فرضِ اولین تھا۔ پھر ہم اس جنت میں کھو گئے جس کی خاطر ان لاکھوں محبانِ وطن نے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ لینن گراد خوبصورت دریاؤں اور پلوں کا شہر ہے۔ دریائے نیوا اس شہر کے دل کی دھڑکنوں کا ترجمان ہے۔ اس دریا میں وہ تاریخی جہاز "ارور" آج بھی لنگر انداز ہے جس سے انقلاب کا پہلا صور پھونکا گیا تھا۔ اور اکتوبر انقلاب کے وقت توپ کا پہلا گولہ شہنشاہ زار کے محل پر پھینکا گیا تھا۔ وہ توپ آج بھی جہاز پر نصب ہے اور دنیا کے انقلاب پسندوں کے حوصلے بڑھاتی ہے۔ یہ جہاز انقلاب روس کا گواہ اور ایک زیارت گاہ ہے۔ اور وہ قصرِ شاہی۔ "ونٹر پیلس" سرما محل جہاں سے زارشاہی کے مظالم کے چشمے پھوٹتے تھے آج ایک میوزیم کی شکل میں موجود ہے قیمتی پتھروں کے ستونوں اور سونے کی چادروں سے بنا یا ہوا یہ محل دیکھ کر اور اسے نادر اشیا سے آراستہ پا کر محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ مگر نہیں۔ اس قصرِ زرو

جواہر کی قسمت کا تختہ پلٹے نصف صدی بیت چکی ہے۔ یہ سنہرا محل جس میں کئی ٹن سونا لگا ہے۔ زبان حال سے اس حقیقت کو آشکارا کر رہا ہے کہ وہ دولت اور شان جو عوام کے کام نہ آئے، اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو زار روس کا ہوا۔ بہر حال اس محل کی آرائش اور زیب و زینت قابل دید ہے اور انسانی ہاتھوں کی محنت کا کمال ہے۔ یہاں ایک شہزادی کا قصر تو بالکل سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس کی چھت اور دیوار و در کے ایک ایک چپہ پر سونا لگا ہوا ہے۔ یہ قصر شہزادی کی فرمائش پر سونے کی چادروں سے ہی بنایا گیا تھا۔ جنگ کے دوران اس محل کو سوویت عوام نے بڑی قربانیاں دے کر بچایا تاکہ تاریخ محفوظ رہ سکے۔

"ونٹر پیلس" کو دیکھنے کے بعد اس عمارت کو دیکھنے کا اور ہی لطف آیا جس کے در و دیوار میں آج بھی لینن کی انقلاب آفریں آواز گونجتی ہے۔ یہ عمارت پہلے شہزادیوں کی درس گاہ تھی جسے پارٹی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور یہیں وہ تاریخی فیصلے ہوئے جنہوں نے سوویت یونین کی تاریخ بدل دی اور ایسا انقلاب برپا کیا جس کا اثر آج ساری دنیا کے عوام پر ہے اس عمارت کے احاطہ میں لینن کا قد آدم مجسمہ ہے نہایت شاندار جس میں لینن آہنی عزم کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں۔ سرما محل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اے انقلاب کے داعیو بڑھو اور شاہی کا غرور چور چور کر کے اس قصر کو اپنے اقتدار میں لے لو اور عنان حکومت ظلم کے ہاتھوں سے چھین لو یہیں لینن نے انقلابی دستوں کو خطاب کیا تھا اور یہیں سے ونٹر پیلس کی قسمت کا فیصلہ سنایا گیا تھا۔

"شاہان زار کا سمر پیلس" جہاں وہ گرمیاں گزارتے تھے لینن گراد

کے نواح میں پچیس ۲۵ میل دور بحرۂ فن لینڈ کے کنارے ہے اس رشک فردوس باغ میں فواروں کی بہار قابل دید ہے۔ قیمتی پتھروں اور سونے کے پتروں سے جڑے ہوئے ہوش ربا فوارے۔ جن کی بہار دیکھتے ہی بنتی ہے۔ نہایت خوبصورت مجسمے بنائے گئے ہیں۔ ان فواروں کی شکل میں جنگ کے دوران بہت سے فوارے اور مجسمے شکستہ ہو گئے تھے۔ مگر آرٹ اور فن کے قدر دانوں نے ان کی مرمت کر کے مثل اصل بنا دیا اور اب ان پر انقلاب زمانہ کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ تاریخ کی عظمتوں کو محفوظ کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے۔

لینن گراد آرٹ اور فن کے شائقین کے لیے جنت نگاہ ہے۔ یہاں کا آرٹ میوزیم۔" ہرمنیاژ" اس شہر کی ہی نہیں۔ دنیا کے فن مصوری کی روح ہے۔ یہاں کے فنکاروں نے ہرمنیاژ کو نازیوں کی بمباری سے بچانے کے لیے بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی چھت پر موسم کے اعتبار سے ایسے رنگ لگا دیئے جاتے تھے کہ اوپر سے میدان ہی نظر آئے۔ یہ میوزیم کئی بلڈنگوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اتنا بڑا ہے کہ اس کو دو چار روز میں دیکھنا ممکن ہی نہیں۔ اس میں چار سیکشن ہیں۔ اور صرف یورپین سیکشن میں ۱۳۰ کمرے ہیں۔ اس کی تعمیر ۱۸ ویں صدی میں شروع ہوئی اور ۱۹ ویں صدی میں اس کی اندرونی آرائش کا کام مکمل ہوا۔ اس میوزیم میں دنیا بھر کے عظیم مصوروں کی تصویریں جمع کی گئی ہیں۔ اور دنیا کے آرٹ کے نمونے موجود ہیں۔ بہت سی اصل تصویروں کی نقلیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً مونا لیزا۔ لیونارڈو کی دو نادر تصویریں صرف اسی میوزیم میں ہیں جنہیں آرٹ کی دنیا میں اہم مقام حاصل ہے۔

ان میں سے ایک پینٹنگ کا نام ہے ۔ ماں اور بچہ ۔ یہ روح و دل کو اپنی طرف کھینچنے والی تصویر ہے ۔ " ہرمتیاژ " کی تصویریں دیکھ کر آرٹ اور فن مصوری کے بتدریج ارتقا کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے ۔ قدیم نمدلوں سے لے کر پکاسو تک کی تصویروں کی نمائش ہے ۔ مختلف اسکولوں کی تصویریں دیکھتے دیکھتے جب ہندوستان کی عوامی زندگی سے متعلق شوخ رنگوں والی تصویروں پر نظر پڑی تو بے اختیار پیارے وطن کی یاد آئی ۔ ۲۰ رجون کا یہ دن زندگی کا ایک یادگار دن تھا جب میں نے مشہور زمانہ " ہرمتیاژ " کی سیر کی ۔

لینن گراد میں علم و ادب کے پرستاروں کے لیے " دستو وسکی میوزیم قابل دید ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اس عظیم مصنف نے زندگی کے آخری دو سال گذارے تھے ۔ دستو وسکی سوویت یونین کا ہی نہیں ، دنیا کا عظیم ناول نگار ہے اور لینن کی ناقدانہ نظر نے ٹالسٹائی کے بعد دوسرا درجہ دستو وسکی کو ہی دیا تھا ۔ اس میوزیم میں نہ صرف دستو وسکی کی تصنیفات ہیں بلکہ اس کی زندگی کی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں ۔ اس نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں اور جیل میں جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ زندگی گذاری تھی اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا ۔ اس لیے اس کا ناول "جرم و سزا" عالمی ادب کا ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے ۔

"جرم و سزا" کے ذکر کے ساتھ ہی پیٹر و پال فورٹ یاد آگیا جہاں گرجا گھر بھی ہے ۔ یہ فورٹ ۱۷ ویں صدی عیسوی میں بنوایا گیا تھا ۔ اور یہاں سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے ۔ اس قید خانے کا سب سے پہلا قیدی شاہ پیٹر کا لڑکا تھا جس نے اپنے باپ کے خلاف سازش کی تھی ۔ اور آخری قیدی کاکرنسکی کے ساتھی تھے ۔ اس قید خانے میں کچھ دن گورکی بھی رہے ۔

لینن بھی رہے۔ یہ کمرے آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ اکتوبر انقلاب کے بعد اس قید خانے کو میوزیم بنا دیا گیا ہے اور اب یہاں قیدی نہیں سیاح آتے ہیں۔ یہ فورٹ لینن گراد کی تاریخ کی نشان دہی کرتا ہے۔ دریائے نیوا کو اس کے دروازے تک لایا گیا تھا اور اس طرح بندرگاہ کی کمی کو پورا کیا گیا تھا۔ اس کے گرجا گھر میں جب بارہ بجتے ہیں تو توپ داغی جاتی ہے اور شہر بھر کے لوگ اپنی گھڑیوں کو ملاتے ہیں۔ گویا آج بھی قلعہ وقت کا نغمہ گاتا ہے۔

لینن گراد میں ہی گورکی سینٹر آف کلچر دیکھنے کا موقع ملا۔ سوویت یونین میں آرٹ اور کلچر کی ترویج اور اشاعت کے لئے ہر جگہ بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے اور یہ کلچرل سینٹر اس کی ایک مثال ہے یہاں آثار گورکی تو موجود ہیں ہی۔ کلچر کو ترقی دینے کے لیے جملہ انتظامات کئے گئے ہیں۔ اس سینٹر میں بچوں کے تھیٹر، سینما ہال، پرنٹنگ ہاؤس، عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مرکز اور مختلف ثقافتی شعبے اوپیرا، سرکس، اور رقص و موسیقی سے متعلق مراکز موجود ہیں۔ بچوں کی کارکردگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے طلباء ہر سال ۲۰۰ شو پیش کرتے ہیں۔ گورکی سینٹر آف کلچر میں ایک بڑی لائبریری بھی ہے جس میں مختلف علوم کی ۱۵۹ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین میں ادیبوں اور فنکاروں کی کتنی قدر و منزلت ہے۔

لینن گراڈ ماضی کی عظمتوں، انقلابی مہمات کی یادوں فن و شعر اور آرٹ اور کلچر کی روح پرور جنتوں کا شہر ہی نہیں، بلکہ جدید زندگی کی گہما گہمی اور زنرنیاتی منصوبوں کی تکمیل کا بھی شاہد ہے۔ ماسکو کی طرح یہاں بھی

جن فیکٹریوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا ان سے اندازہ ہوا یہ قدر مشترک ہے کہ مزدوروں کو خاطر خواہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور ان کے آرام و آسائش اور ذہنی آسودگی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت اور تفریح پر بہ طور خاص توجہ دی جاتی ہے۔ کام بہت اور گامکار کم۔ عورتیں بڑی تعداد میں کام کرتی ہیں۔ ہم نے لینن گراد میں گرم کپڑوں کی ایک فیکٹری دیکھی جس میں ۷۰ فی صدی تعداد عورتوں کی ہے اور یہ فیکٹری ٹیکسٹائل میں درجہ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔

لینن گراد کی سیر کرتے وقت بمبئی کی بہت یاد آئی۔ کہیں بمبئی کے فورٹ علاقہ کا گمان گزرا۔ کہیں بلارڈ پیر کا اس شہر کے ایک حصہ میں ٹرام بھی چلتی دیکھی۔ اور چلتے چلتے ہماری نظر ایک عالی شان مسجد پر پڑی۔ ظہر کا وقت تھا ہم کچھ لوگ جن میں مونس رضا، ابوبکر اور زینب بیگم بھی شامل تھیں۔ مسجد میں پہونچے۔ اس وقت باجماعت نماز پڑھی جارہی تھی دو صفیں تھیں۔ مسجد کی پہلی منزل پر کچھ عورتیں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھیں۔ زینب صاحبہ نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ ہمارے ایک ساتھی اگلے دن جمعہ کی نماز بھی پڑھنے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ نماز جمعہ میں تقریباً چھ، سات سو آدمی تھے۔ یہ مسجد وسط ایشیا کے طرز کی نہایت خوبصورت مسجد ہے۔ نہایت بلند اور ریک بینار اس کی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر اس صدی کے اوائل میں ہوئی ہمیں بتایا گیا کہ صدر مصر جمال عبدالناصر نے جب اس شہر کا دورہ کیا اس وقت غیر آباد تھی۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ اسے آباد کیا جائے اور تب سے یہاں پانچوں وقت کی نماز باجماعت ہوتی ہے۔ لینن گراد میں مسجد کی یہ

شان دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں فکر و نظر اور عقیدہ و خیال پر پابندی نہیں ہے۔

ہم لوگ ۱۹ر جون کو لینن گراڈ آئے تھے اور ۲۲ر جون تک وہاں رہے۔ نہایت لطیف اور خنک موسم۔ روشن موسم جاگتے رہنے کا موسم یہ دن لینن گراڈ میں طویل ترین دنوں کے ہیں۔ اور یہاں کئی راتیں بھی سفید ہوتی ہیں۔ ہمارا ہوٹل دریائے نیو کے قریب ہی تھا۔ ۲۱ر جون کو دریا کے کنارے ٹہلتے رہے۔ دس بج چکے۔ مگر سورج اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ پھر ایسا اجالا ہو گیا کہ سڑکوں پر مصنوعی روشنی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ یہ دن ایک روشنی کے تیوہار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ ذوق نظارا دل و نگاہ میں لیے ملک کے مختلف حصوں سے لینن گراد آتے ہیں۔ گاتے ہیں، ناچتے ہیں اور خوشی کے روشن پھولوں سے دامن دل بھرتے ہیں۔

کچھ دیر دھندلکا سا رہا۔ پھر آسمان پر رنگوں کے قافلے آنے لگے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ دو بجے ہوں گے کہ پھر سورج کی کرنیں مسکرانے لگیں۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ شہر بیداری کا شہر ہے، یہاں راتیں بھی جاگتی ہیں۔ دل بھی جاگتے ہیں۔ انقلاب بھی جاگتے ہیں اور ترقی و تعمیر کے نئے نئے ارادے بھی جاگتے ہیں۔ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا۔ اس سفید رات کے سحر کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اور یہی احساس ایک نظم کی صورت اختیار کر گیا۔

سفید رات :

رات کے دس بجے
غسل کرتی ہے دھوپ۔۔
سارے دن کی مسافت سے تھک ہار کر

اور نیوا کی لہروں پہ پھیلا کے پر
رقص کرتی ہے، شوخی سے،
پیڑوں پہ چڑھ جاتی ہے۔
چہچہاتی ہے۔ اور مسکراتی ہے دھوپ
جیسے چاندی کی چادر بچھا دے کوئی
فرش سے عرش تک
دھوپ کی مسکراہٹ کے پھولوں سے دامن بھرے
مردو زن،
گلبدن، سیم تن
تیرہ راتوں کے احساس کو بھول کر
جام چھلکاتے ہیں پیار کے
اور اجالے کی عظمت کے اقرار کے
پھر مہکتے اجالے کے طوفان میں
رات کے دو دیئے
اپنے چہرے سے چاندی کا آنچل ہٹاتی ہے دھوپ
اور نیوا کی لہروں میں سوتے کی کلیاں کھلاتی ہے دھوپ۔"

لینن گراد کی سحر خیز راتوں کا نشہ دل میں اتر گیا۔ اور سنہرے دنوں اور چاندی طرح اجلی راتوں کے اس شہر سے جب ہم ۲۲ جون کی شب میں تاجکستان کے لئے روانہ ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دل کا ایک گوشہ وہیں رہ گیا ہے۔

لینن گراد سے ہم جس جہاز میں سوار ہوئے اس میں کسانوں اور

کامگاروں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان ایشیائی لوگوں کے سادہ لباس اور نشست و برخاست سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ یورپ کے تمدن کے پروردہ نہیں ہیں۔ سوویت یونین میں ہوائی جہاز کے سفر کی سہولتیں عام ہیں رات کے نو دس بجے ہمارے جہاز نے پرواز شروع کی تو آدھی رات کے قریب الکیانارکے لینن کا آبائی وطن۔ وہاں تقریباً آدھ گھنٹہ قیام کرنے کے بعد پھر پرواز۔ اور ہمارا جہاز کوہِ یورال اور بحیرۂ ارل پر پرواز کرتا ہوا تاشقند پہونچا۔ تاشقند کے ہوائی اڈے پر ہمارا وفد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ شری راجہ رام شاستری کی قیادت میں کچھ لوگ وہیں ازبکستان کی سیاحت کے لیے اتر گئے اور میں دوسرے گروپ میں شامل تھا جسے ڈاکٹر شریا کی کی قیادت میں تاجکستان کے صدر مقام دوشنبے جانا تھا۔ علی الصبح ہم دوشنبے اترے جہاں اطلس و کمخواب میں ملبوس تاجیک لڑکیوں نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ اور پامیر کے دامن میں کھلے پھولوں کے گلدستے پیش کئے۔ وہی ایشیائی مہمان نوازی کی مانوس فضا، وہی سادگی اور خلوص سے مسکراتے ہوئے چہرے۔ حیا میں ڈوبی ہوئی خواب آلود آنکھوں والی لڑکیوں نے جب ہمیں پھول ہار پہنائے تو محسوس ہوا کہ ہم گھر واپس آ گئے ہیں۔

تاجکستان، کشمیر سے ادھر۔ پامیر کے شمال میں ہے ہندوستان کی سرحد سے بہت قریب۔ جغرافیائی ہیئت کے اعتبار سے وادیٔ کشمیر معلوم ہوتا ہے مگر آب و ہوا کے اعتبار سے مختلف ہے۔ بحرِ ہند کی مانسونی ہواؤں کو کوہِ ہمالہ سینہ سپر ہو کر روک لیتا ہے۔ اور تاجکستان میں بارش کم ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں پہاڑوں پر گھنے

جنگل اور دیودار جیسے تناور درخت نہیں۔ اور اس نناسبت سے گرمی بھی زیادہ پڑتی ہے۔ مگر سلسلۂ کوہ پامیر سے نکلے ہوئے تیز رو دریا بڑے بانکپن کے ساتھ بہتے ہیں اور شہر میں پھلوں کے باغات کو سیراب کرتے ہیں پیچ در پیچ انگور کی بیلیں۔ اور میوہ دار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔ ان سب خصوصیات نے مل کر تاجکستان کو بہت ہی خوبصورت بنا دیا ہے۔

یہاں آکر ہندوستان۔ اور خاص طور پر اپنے شمالی ہندوستان کے قصبوں اور چھوٹے شہروں کی بہت یاد آئی۔ ہر منظر مانوس سا، ہر چہرہ آشنا سا سا لگا۔ وہی شام کو سبزہ زاروں میں چہل قدمی۔ قدیم ایشیائی زندگی کے خدو خال۔ تیل مالش کرنے والے، اور سینگی لگانے والے اور یگانگت پر مستزاد تاجیک زبان۔ بالکل وہی زبان جسے ہم نے قدیم فارسی کے نام سے بچپن میں پڑھا ہے۔ وہی لب و لہجہ۔ ہاں اب رسم الخط روسی اپنا لیا گیا ہے دوشنبے کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے یہ احساس کتنا خوش آیند تھا کہ ہندوستان یہاں سے صرف ڈیڑھ سو میل جنوب میں ہے ۱۹۲۹ء میں جب یہاں سوویت ری پبلک قائم ہوئی تو یہ شہر، ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس زمانے کے فوٹو ہم نے دیکھے۔ پھونس کے بنائے ہوئے جھونپڑوں میں یہاں کے سرکاری دفاتر تھے۔ اور پھر اس جگہ تیزی سے تعمیرات شروع ہوئیں۔ جدید طرز کا ایک چھوٹا سا شہر بنا۔ جدید فن تعمیر کی وجہ سے دوشنبے میں قدیم ایشیائی طرز کی عمارتوں کا وجود نہیں ہے۔ حالانکہ وہ جھلک ماسکو اور لینن گراد میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ خاص طور سے لینن گراد کی مسجد۔ لیکن ایک مزے کی بات یہ ہے کہ موسم قدرے گرم ہوتے کے باوجود یہاں ہوٹل میں پنکھے نہیں تھے۔ لوگ پنکھوں کے عادی نہیں معلوم ہوتے

حالانکہ موسم کے اعتبار سے پنکھوں کی ضرورت تھی۔

بہرحال اب 'دوشنبے' ایک جدید شہر ہے جو ایک خوبصورت وادی میں بسا ہوا ہے۔ تاجکستان میں پہاڑی ندیاں ہر طرف گیت گاتی ہیں نہایت تیز رو۔ اور صاف شفاف پانی فطرت کا آئینہ دکھاتا ہے۔ دوشنبے سے کچھ دور۔ ہم یہاں کا مشہور ڈیم 'توریک' دیکھنے گئے۔ جسے سوویت انجینئروں نے دریائے وحش کی روانی اور نغمگی کو تالاب میں کر کے بنایا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ تکمیل کے بعد یہ باندھ دنیا کا سب سے اونچا باندھ ہوگا۔ کبھی یہ علاقہ۔ بنجر پہاڑی علاقہ تھا۔ اب یہاں باندھ کی لمبی جھیل ہے جس کا صاف شفاف پانی تاجکستان کے روشن مستقبل کا آئینہ دکھا رہا ہے۔ ابھی یہ جھیل ۱۸۰ میٹر گہری ہے اور باندھ مکمل ہونے کے بعد ۳۰۰ میٹر گہری ہو جائے گی۔ (مگر یہ بات جون ۱۹۷۳ء کی ہے) ہم نے ایک کشتی میں بیٹھ کر اس سمندر نما جھیل کی سیر کی اور اس کے ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھایا۔

تاجیک زبان رودکی، فردوسی، حافظ اور خیام کی زبان ہے اور قدیم فارسی زبان کا کلاسیکی ادب تاجیک زبان کا بھی ادبی ورثہ ہے۔ اس امر کی تصدیق دوشنبے میں فردوسی لائبریری دیکھنے سے ہو جاتی ہے۔ یہ لائبریری ایک دو منزلہ عمارت میں ہے یہاں ۱۹۳۳ء سے نادر کتب اور قلمی نسخوں کو جمع کرنے کا کام شروع کیا گیا تھا۔ اور اب یہاں ۲ ہزار قلمی نسخے ہیں جن میں بڑی تعداد فارسی اور عربی قلمی نسخوں کی ہے۔ کل ۱۶ زبانوں کے قلمی نسخے یہاں موجود ہیں۔ فلسفہ، تاریخ، فقہ، ادب و شعر ہر موضوع پر نادر کتابیں ہیں۔ میں نے یہاں منجملہ اور حسین نسخوں کے، نسخۂ تاریخ فیروز شاہی، نسخۂ دیوان امیر خسرو، نسخۂ گلستان سعدی اور

نسخۂ شاہنامۂ فردوسی بھی دیکھے اور محسوس ہوا کہ یہ لائبریری مستشرقین کے لیے مطالعہ کا اہم مواد فراہم کرتی ہے اور بالخصوص ایشیائی ممالک کے ثقافتی رشتوں کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

اس طرح دوشنبے یونیورسٹی کو دیکھ کر یہاں کے تعلیمی منظر نامے کا اندازہ ہوتا ہے یہ یونیورسٹی جب ۲۰ سال پہلے قائم ہوئی تھی تو اس میں کل ۱۰۰ طالب علم اور ۱۳ ٹیچر تھے اب (یعنی ۷۳ سے ۷۴ میں) ۱۳ ہزار طالب علم ہیں اور علم و سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی یہاں تدریس نہ ہوتی ہو!

دوشنبے میں ہمارا قیام کئی دن رہا اور اس دوران ہم نے ایشیائی کھانے، پلاؤ۔ قورمہ، تندوری روٹیاں۔ خوب سیر ہو کر کھائیں جن کو ماسکو اور لینن گراد میں ترس گئے تھے۔ حسب معمول فیکٹریوں اور کارخانوں کی سیر کی اور کامگاروں کی خوش حالی دیکھی۔ ایک مضافاتی علاقے میں ایک کسان کا گھر بھی دیکھا جو اپنے چھوٹے سے گھر کا مالک تھا اور جس کی بیوی ہندوستانی کسانوں کی بیویوں کی طرح گھر کا کام کاج ہی کرتی تھی۔ گائے اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ روایتی سادگی اور شرم و حیا کا پیکر تھی۔

دوشنبے کی ۲۶، جون کی رات ایک پر بہار رات تھی۔ ہم لوگوں کے اعزاز میں تاجیک ری پبلک کی اعلیٰ سوویت کے صدر میرشکر وف نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں وزیر ثقافت کامریڈ سکندر روف بھی موجود تھے اور بوڑھے سے قد والی مادام ملاحت بھی جنہوں نے سروجنی نائیڈو کے فن اور زندگی پر کام کیا ہے اور جنہیں ہندوستان سے بے پناہ عقیدت ہے کامریڈ رحمت اللہ ایشیائی میزبانی کی روایت کے

امانت دار ہمارے ساتھ ماسکو میں بھی تھے اور وہیں سے ہمیں اپنے ساتھ دوشنبے لائے تھے۔ میر شکر وت کی پرکشش شخصیت اس محفل کی روح تھی۔ وہ خود بھی شاعر ہیں اور شاعری کے دلدادہ ہیں۔ علامہ اقبال پر ایک کتاب کے مصنف اکبر اور بیربل کے قصوں کو انہوں نے تاجیک زبان میں منتقل کیا ہے۔ اس محفل میں رقص و نغمہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کے اصرار پر میر شکروت نے اپنا تاجیک کلام سنایا۔ میں نے بھی اس حسین سرزمین کے بارے میں اپنی تازہ ترین نظم۔ "ایں تاجکستان حسین" سنائی۔ اس کے کچھ بند ے

من آمدم دیوانہ وار ــــ دردا دئ صدلالہ زار
ہر غنچۂ باغِ شما ــــ بخشد محبت بے کنار
منزل بہ منزل گامزن ــــ نغمہ زند جوئے رواں
دارد چہ معنی بے شمار ــــ خاموشئ کوہِ گراں
ایں شہر، شہرِ زندگی ــــ ایں سرزمینِ رودکی
ایں بزمِ تہذیبِ کہن ــــ گہوارۂ دانشوری
در شہرِ حسن و دوستی ــــ می خواندم اشعارِ من
آئینۂ ہندوستان ــــ الفاظِ فن، گفتارِ من

نظمیں، غزلیں، رقص، موسیقی، پر تکلف کھانے، پر خلوص باتیں لطیفے، قہقہے، دیر گئے رات تک یہ محفل جاری رہی اور اگلے دن تاجکستان کے نظاروں کو نگاہوں میں بسائے اور نئے دوستوں کی یادیں دل میں لیے ہم لوگ ماسکو پرواز کر گئے۔

ماسکو میں ہمارے وفد کے آخری دو دن بڑی گہما گہمی میں گذرے ریڈیو ریکارڈنگ، شاپنگ، نئے پرانے دوستوں سے الوداعی

ملاقاتیں۔ اسی دوران ونو دبھاٹیہ مجھے ایک عوامی قسم کے ہوٹل میں لے گئے جہاں نوجوانوں کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا کہ سوویت یونین کی نئی نسل۔ وہ نسل جس نے انقلاب کی جدوجہد اور پھر دوسری جنگ عظیم کی تباہی نہیں دیکھی اور جس نے آنکھ کھولتے ہی نئے سوویت نظام کی برکتوں کی فراوانی کو اپنے اردگرد پایا۔ کس قدر خوش باش اور بے فکر ہے اسے یقین ہے کہ مستقبل محفوظ ہے اس لئے زندگی کو مکمل رعنائیوں کے ساتھ گذارنا چاہیے اور غم اور تشکیک اور بے اطمینانی کا دل کی دنیا میں گذر نہ ہونا چاہیئے۔ ونو دبھاٹیہ کے ساتھ اس شام میں نے سوویت یونین کی زندگی کے ایک اہم پہلو کا مطالعہ کیا۔

انہیں دو دنوں میں ہمارے ڈیلی گیشن کو صدر کوسی گن نے مدعو کیا اور اس سنجیدہ اور پرشکوہ تقریب میں صدر سوویت یونین نے اپنا خیرسگالی کا پیغام ہندوستانی عوام اور وزیراعظم کے نام دیا ان کے الفاظ میں صداقت کی مہک تھی اور خیالات میں تاریخی حقیقتوں کا عرفان صدر کوسی گن نے امن عالم کے قیام کے لیے ہندوستان کی کوششوں کو سراہا اور اسے انسانیت کے مستقبل کے لیے فالِ نیک قرار دیا اور ہند سوویت دوستی کو وقت کی اہم ضرورت سے تعبیر کیا۔

اور آخر وہ دن بھی آ گیا جب ہمارے میزبان سوویت ہند کلچرل سوسائٹی کے صدر کامریڈ گو لڈن نے الوداعی پارٹی دی۔ ایک پربہار تقریب ایک پرتکلف محفل جس میں میزبان مہمان، اور ہند و سوویت دوستی کے خواہاں سب سے اہل قلم دانشور، مدیر اور صحافی موجود تھے۔ اس پارٹی میں ہمارے بھی دوست اکٹھے ہو گئے تھے اب ہم ایک دوسرے کے آشنا تھے اور

جذباتی طور پر ہم آہنگ۔ اس موقع پر مجھ سے کچھ پڑھنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے اپنے خیالات کی ترجمانی ایک نظم سے کی "اے میرے پردیسی ساتھی۔"
اس نظم کے آخری مصرعے ہ

اے میرے پردیسی ساتھی!
تیرے شہر کے چمکیلے اور البیلے دن
اجلی اور نشیلی راتیں
مسکان کی چنچل لہریں
لہراتے پیڑوں کی قطاریں
ہنستے کھیلتے گاتے بچے
محنت کے ہاتھوں کے ترانے
کیا میں ان کو بھول سکوں گا

اے میرے پردیسی ساتھی
میں ٹھہرا اک اڑتا پنچھی
آج نہیں تو کل اڑ جاؤں
لیکن اپنی محبت۔ اور عقیدت کے پھولوں کو
تیری نذر کیے جاتا ہوں
موسم بدلیں، طوفاں آئیں
پھول نہ یہ مرجھانے پائیں
اے میرے پردیسی ساتھی!

اور اس طرح میں نے اپنے میزبانوں کو آخری سلام پیش کیا۔ اور کامریڈ گولڈن نے اظہار تشکر کرتے ہوئے نہایت پرخلوص اور جذباتی

انداز میں ہم سب کو الوداع کہا جو ہندوستان سے ہندوستانی عوام کی دوستی اور محبت کے پھول لے کر گئے تھے اور سوویت یونین سے رفاقت اور خلوص کے پھولوں سے اپنا دامن بھر کر لوٹ رہے تھے۔

۲۹ر جون کی رات کو ہم ایروفلوٹ میں سوار ہو گئے اس امید اور یقین کے ساتھ کہ صبح ہندوستان کی سرزمین پر ہوگی اور ۳۰ر جون کا چمکیلا سورج پالم ایرپورٹ نئی دہلی پر ہماری راہوں میں اپنی کرنوں کے پھول بچھائے گا۔ مگر ۳۰ر جون کی صبح ہمارا جہاز زمین پر نہ اترا۔ بلکہ آسمان میں ہی گردش کرتا رہا۔ اور پھر ہمیں بتلایا گیا کہ جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر اتر رہا ہے۔ کیوں ؟ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کراچی ایرپورٹ پر ہم کافی دیر اپنے جہاز میں بند بیٹھے رہے جو ایرپورٹ پر کھڑا دھوپ کی تپش کو ہمارے جسموں میں تحلیل کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جہاز پھر اڑا۔ دہلی کے آس پاس منڈلایا اور پھر کراچی واپس آ گیا۔ اس بار دروازہ کھول دیا گیا۔ اور ہم سب لوگ پولیس کی دوروبہ قطار کے بیچ سے گذر کر ایک بس میں جا بیٹھے جس نے کراچی ایرپورٹ کے لاؤنج میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ تقریباً دو گھنٹے ہم ایرپورٹ پر رہے۔ مگر ایک ایک کپ چائے کے علاوہ کچھ کھانے پینے کو میسر نہ آیا۔ دل رہ رہ کر تڑپ اٹھتا تھا کہ اس کراچی میں ان گنت ہمارے دوست اور عزیز و اقارب ہیں اور ہم یہاں بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ واہ رے دقت و سیاست کی مصلحتیں۔ لاؤنج کی میزوں پر دو چار پاکستانی اخبار پڑے تھے۔ وہ بھی فوراً اٹھا لیے گئے تھے شاید اس خیال سے کہ ہم ہندوستانی کچھ تازہ خبریں نہ پڑھ لیں۔

آخر دو گھنٹے بعد پھر جہاز میں واپس بیٹھ جانے کا حکم صادر ہوا۔ اور

خدا خدا کر کے ہم تیسرے پہر پالم ہوائی اڈے پر اترے۔ معلوم ہوا کہ کسی جمبو جیٹ کا پہیہ پھٹ گیا تھا جس سے ہمارے ایئر فلوٹ کو پالم پر اترنے کے لیے مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اور کراچی کے علاوہ آس پاس کے کسی اور ہوائی اڈے پر بھی جگہ نہیں تھی۔ بہر حال ۳۰ر جون کی چلچلاتی سہ پہر یہاں ہم امن و محبت کے متوالے سلامتی کے ساتھ واپس آگئے ان پھولوں کی خوشبو فضاؤں میں پھیل گئی جو ہم دامنِ دل بھر کر لائے تھے۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

(ذکر حضرت امیر خسرو)

"بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی،" زندگی کے سفر کی منزل کو پہنچنے کا تصور کرنے میں کتنی روایت اور روحانیت ہے۔ کتنی رنگینی، شوخی اور ہندوستانیت ہے۔ ان چند بولوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں اور دشواریوں کا احساس بھی ہے اور ان دشواریوں پر قابو پانے کا حوصلہ اور یقین بھی۔ یہ سریلے بول طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کے دل کی دھڑکنیں ہیں جو سات سو سال سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ اور آج بھی کیا جذب و کیف کے اس عالم میں کہ حضرت امیر خسرو اپنے پیر و مرشد محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی پائنتی ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کے یہ سریلے بول ایک عالم میں گونج رہے ہیں۔

"بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی"

حضرت امیر خسرو کی باکمال زندگی کا سفر ۱۲۵۳ء میں شروع ہوا

اور زندگی کی کٹھن ڈگر سے گزر کر وہ اپنی منزلِ مقصود پر ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء یعنی ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو پہنچے۔ اور اپنے پیر و مرشد کی وصیت کے مطابق ان کی پائنتی جگہ پائی جنھوں نے فرمایا تھا۔

"اگر ایک قبر میں دو لاشوں کو دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں خسرو کو دفن کراتا۔"

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی پر دیس

حضرت امیر خسرو کا عرس مبارک ہر سال شوال میں منعقد ہوتا ہے اور ستر ھویں شریف کے نام سے مشہور ہے جس میں اہل علم و فضل صوفیائے کرام دانشور اور ہزار ہا ارادت مند شریک ہو کر اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا کے دامن سے وابستگی کے فیض نے امیر خسرو کو تصوف اور روحانیت کی اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنے زمانے کی آلودگیوں اور لہو لعب سے پاک رہے۔ اور طوائف الملوکی کے اس دور میں کئی بادشاہوں کی مصاحبت اور ملازمت کرنے کے باوجود ان کا دل کسی کا غلام نہ ہو سکا سوائے اپنے پیر و مرشد کے۔ اپنے مرشد کی خوشنودی انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب سلطان جلال الدین خلجی نے محبوب الٰہی کی اجازت و اطلاع کے بغیر ان کی خانقاہ میں باریاب ہونے کا ارادہ کیا تو سلطان کے اس ارادے کی اطلاع انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا کو پہنچا دی محبوب الٰہی نہ کبھی شاہی دربار میں گئے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی بادشاہ ان کی خانقاہ میں آئے چنانچہ وہ اس روز اپنے پیر و مرشد حضرت بابا فرید کے

مزار کی زیارت کرنے پاک پٹن شریف کے لیے روانہ ہو گئے۔ سلطان کو بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے حضرت امیر خسرو سے جواب طلب کیا تو انھوں نے بے دریغ کہہ دیا کہ حضرت کی خفگی سے جان جانے کا ڈر ہے اور پیر و مرشد کی ناراضگی سے ایمان جانے کا خطرہ ہے اور مجھے ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے۔

حضرت امیر خسرو کی زندگی اس امر کی بہترین مثال ہے کہ معرفت کی منزل پر پہنچنے کے لیے ترک دنیا ضروری نہیں، بلکہ انسان زندگی کے تمام معمولات پورے کرتے ہوئے بھی اس راہ پر کامیابی سے چل سکتا ہے اگر اس کا دل صاف ہے لیکن یہ زیادہ دشوار راستہ ہے حیات خسرو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد کی زندگی ہے۔ ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود بلخ کے لاچینی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور تاتاریوں کے ہاتھوں ترکستان کی تباہی کے بعد وہ ۱۲۲۰ء میں ہندوستان آئے۔ ہندوستان کی سرزمین نے انھیں پناہ دی اور وہ پٹیالی ضلع ایٹہ میں مقیم ہوئے جو اس وقت مومن آباد یا مومن پورہ کہلاتا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا۔ امیر سیف الدین کی رسائی کچھ ہی عرصہ بعد شاہی دربار تک ہو گئی اور انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے سلطانی ملازمت اختیار کر لی اور سلطنت کی توسیع میں ان کی مدد کی بلخ کے اس امیر کی شادی دہلی کے ایک باکمال بزرگ ملک عماد الملک کی صاحبزادی سے ہوئی جن کے بطن سے ۱۲۵۳ء میں ابوالحسن یمین الدین پیدا ہوئے جو آگے چل کر امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا بچپن تو پٹیالی میں گزرا مگر جب چار سال کے ہوئے تو ان کے والد انھیں دہلی

سے آئے۔ گویا امیر خسرو نے امارت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اعلیٰ تعلیم و تربیت نے ان کے ذہن رسا کو اور جلا دی۔

اس آٹھ نو سال کے بچے کی آنکھیں سلطان ناصرالدین محمود کے پُرشکوہ دربار کے خیرہ کن مناظر دیکھ رہی تھیں کہ قدرت نے اس کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ امیر سیف الدین ایک لڑائی میں کام آئے اور والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش اپنے نانا عماد الملک کی نگرانی میں ہوئی۔
ایک روایت کے مطابق عماد الملک کے یہاں کچھ روز حضرت نظام الدین اولیا کا قیام رہا تھا۔ گویا امیر خسرو کو بچپن ہی میں حضرت نظام الدین اولیا کی برگزیدہ شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور دونوں دنیاؤں کی حقیقت واضح طور پر ان کے سامنے آئی ــــ ایک طرف شاہی دربار کے کروفر اور زر و جواہر سے جگمگاتی دنیا ــــ اور دوسری طرف روحانیت کا جاہ و جلال، اور نورِ معرفت سے منور دنیا۔ دونوں اثرات نے خسرو کے مزاج میں کمال کا توازن پیدا کیا۔ انھوں نے سیف نہ چھوڑی کہ ان کے اجداد کی میراث تھی، اور قلم کو مضبوطی سے پکڑا کہ ان کی فطرت کا تقاضہ تھا۔

۱۲۷۳ء میں ان کے نانا عماد الملک کا انتقال ہو گیا۔ اور بیس سال کے اس نوجوان اور صاحبِ سیف و قلم امیر خسرو کو فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ انھوں نے سلطان بلبن کے بھتیجے علاءالدین کشلی خاں عرف ملک چھجو کے درباری شاعر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اور یہیں سے حضرت امیر خسرو کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک طرف بادشاہوں کی قصیدہ خوانی کی، جنگی مہموں میں حصہ لیا، دشمن کے ہاتھوں گرفتار بھی

ہوئے اور دوسری طرف شعر و سخن میں بیش بہا اضافے کئے اور اپنے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے دامن سے تو آخری دم تک وابستہ رہے۔

امیر خسرو کا دور۔ تاریخ کا عجیب دور ہے۔ علم اور معرفت کی دنیا کا یہ عالم کہ حضرت بابا فرید گنج شکر کے وصال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۱۳ سال ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی قدمبوسی کا شرف انھیں ہر وقت حاصل ہے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی ان کے عالم شباب میں منظر شہود پر آچکے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی اور شیخ سعدی جیسے برگزیدہ شاعر کم و بیش ان کے ہمعصر ہیں ——— اور سلطنت دہلی کی طوائف الملوکی کی یہ حالت کہ تاج و تخت کی ہوس میں قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہے۔ بادشاہوں اور امرا کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں۔ سلطنت کے لیے باپ بیٹے اور امرائے سلطنت انقلابات کے شکار ہوتے رہے۔ مگر حضرت امیر خسرو کی قدر و منزلت میں فرق نہ آیا۔ انھوں نے کس کس دربار میں بار نہ پایا ——— کشلی خاں ——— بغرا خاں ——— سلطان محمد ——— امیر علی سرجاندار ——— کیقباد ——— جلال الدین خلجی ——— علاء الدین خلجی ——— قطب الدین مبارک شاہ خلجی ——— خسرو خاں غیاث الدین تغلق ——— امیر خسرو سب کے عزیز رہے اور انھوں نے سب سے اپنے کمال کی داد پائی۔

دہلی کے علاوہ انھیں ملتان اور اودھ کے درباروں میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ جنگی مہمات کے سلسلے میں بھی باہر گئے اور ایک آدھ بار گرفتار بھی ہوئے ——— بغرا خاں کے ساتھ لکھنوتی کی مہم پر گئے ——— ملک کافور کے زمانے میں چنوڑ کی مہم میں شریک تھے، اور قطب الدین تغلق کے ساتھ ——— دیوگری کی مہم میں ——— اور غیاث الدین تغلق کے ساتھ لکھنوتی اور

اودھ کی مہمات میں شریک تھے ـــــ اس طرح خسرو اپنے دور کے سیاسی اُتار چڑھاؤ کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ انھیں عملی طور پر اس میں حصہ لینا پڑا تھا۔
یہ وہ تہذیبی اور تاریخی پس منظر ہے جس نے خسرو کی شاعری کے لیے مواد فراہم کیا اور ان کی فکر کو ایسی ہمہ گیری بخشی کہ آج اہلِ نظر حیران ہیں کہ ایک شخص میں اتنی صفات کہاں سے آگئی تھیں کہ غزل کا سوز و گداز بھی اور گیتوں کی شیرینی بھی، قصیدہ کا شکوہ بھی اور مثنوی کی جادو بیانی بھی۔
وہ زندگی کے ترجمان اور انسانیت کے مدح خواں تھے۔ ان کے کارنامے علم و فن کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ہر جگہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ موسیقی سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ وہ کئی سازوں اور بہت سی راگ راگنیوں کے موجد مانے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین کی قربت اور نسبت نے اس میدان میں بھی ان کے تخلیقی ذہن کو ایک سمت دکھادی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قوّالی، قول، قلبانہ ان کی خاص ایجادات ہیں۔
شعر و سخن کی دنیا میں انھیں ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ـــــ !

"دنیا کی تاریخ میں ایسے شاعر اور عالم کم ہی ملیں گے جنھیں خسرو کے برابر شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی ہو۔ شاید ہم انگلستان میں شیکسپیر اور بائرن کا، جرمنی میں گوئٹے کا اور ایران میں سعدی کا نام لے سکتے ہیں۔ مگر خسرو کی شخصیت میں زندہ دلی، طباعی، تنوع اور شعر گوئی کی غیر معمولی قدرت ایسی صلاحیتیں ہیں جنھوں نے انھیں سارے ہندوستان

میں مشہور کر دیا ہے۔"

لیکن خسروؔ ہندوستان گیر ہی نہیں۔ عالمگیر شہرت کے مالک ہیں ان کی فارسی شاعری قدیم اساتذہ کے ہم پلہ تصور کی جاتی ہے۔ مولانا شبلیؔ نے شعرالعجم میں لکھا ہے۔

"فردوسیؔ، سعدیؔ، انوریؔ، حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں۔ لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ سعدیؔ قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکے، انوریؔ مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکے۔ عرفیؔ اور نظیریؔ غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسروؔ کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رُباعی۔ سب کچھ شامل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے صائب نے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں لیکن امیر خسروؔ کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں ہے۔"

مولانا شبلی نعمانی کے اس بیان سے خسروؔ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود شعرائے ایران نے خسروؔ کی زبان دانی اور کمال شاعری کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ جب شہزاد محمد نے شیخ سعدیؔ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ تو انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کا عذر پیش کرتے ہوئے جواب میں لکھا۔

"در ہند خسروؔ بس است"

حافظ شیرازی انکی شیریں کلامی کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

"شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود"

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ حضرت امیر خسروؔ کے وصال کے اگلے سال خواجہ حافظ شیرازی پیدا ہوئے گویا حافظ نے خسروؔ کی شعری روایت کو آگے بڑھایا۔

آج خسروؔ کے کلام و کمال کا اعتراف دنیا میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے دواوین کے قلمی نسخے دنیا کی اہم ترین لائبریریوں کی زینت ہیں۔ ابھی وہ شب و روز ذہن و دل میں روشن ہیں جب حضرت امیر خسروؔ کے سات سو سالہ جشن کی تقریبات نہ صرف ہندوستان، پاکستان، ایران، روس، بلکہ ترقی یافتہ دنیا کے بہت سے ممالک میں دھوم دھام سے منائی گئیں جگہ جگہ جلسے اور سیمینار منعقد ہوئے اور ان کے انسان دوستی محبت اور یگانگت کے پیغام کو بار بار دہرایا گیا۔ اور جدید دنیا نے اس عظیم المرتبت شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جس چیز نے حضرت امیر خسروؔ کو طوطیٔ ہند بنایا اور عالمی ادب میں ایک نمایاں مقام دلایا وہ ان کا فارسی کلام ہے۔ جو پانچ دیوانوں، نو مثنویوں اور تین نثری تخلیقات پر مشتمل ہے، ان کا پہلا دیوان "تحفۃ الصغر" ہے جس میں ان کا ۱۶ سولہ سال سے ۱۹ انیس سال تک کی عمر کا کلام شامل ہے۔ دوسرا "وسط الحیات" جس میں ۲۰ بیس سال سے ۳۲ بتیس سال تک کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ تیسرا دیوان "غرۃ الکمال" چونتیس ۳۴ سال سے بیالیس ۴۲ سال کی عمر تک کے کلام پر مشتمل ہے ـــــ چوتھا دیوان "بقیہ نقیہ" اور پانچواں دیوان ہے

"نہایت الکمال" جو خسرو کی زندگی کے آخری دنوں کا کلام ہے ان دواوین میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مرثیے اور رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں ـــ خسرو کی غزل کا سوز و گداز اہل دل کی محفلوں کو گرماتا رہا اور ان کی اثر آفرینی کا آج بھی وہی عالم ہے جو پہلے تھا۔ انقلابات زمانہ کا خسرو کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ وقت کے ساتھ اس کی ہمہ گیری بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ان کے فکر و فن کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں اور ان کے کلام کا از سر نو مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

حضرت امیر خسرو کی مثنویاں فارسی ادبیات میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے خدائے سخن نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھا یہ پانچ مثنویاں "خمسہ خسرو" کے نام سے موسوم ہیں اور ان کی تالیف کا زمانہ صرف سوا دو سال ہے جو خسرو کی حیرت انگیز قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ اس سلسلے میں خسرو نے خود لکھا ہے کہ "نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی اور میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے" ؎

شب تا سحر و صبح تا شام　　در گوشۂ غم نگیرم آرام

مولانا جامی نے اپنی تصنیف 'بہارستان' میں لکھا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا ـــ یہ پانچ مثنویاں ہیں نظامی کی "مخزن الاسرار" کے جواب ہیں۔

"مطلع انوار" ـــ جس میں بیشتر صوفیانہ اور اخلاقی اشعار ہیں۔

"خسرو شیریں" کے جواب میں　　"شیریں و خسرو" ـــ

"لیلیٰ مجنوں" کے جواب میں　　"مجنوں و لیلیٰ" ـــ

"سکندر نامہ" کے جواب میں "آئینہ سکندری"
اور نظامی کی "ہفت پیکر" کے جواب میں "ہشت بہشت" ان مثنویوں کے علاوہ ان کی چار تاریخی مثنویاں نہ صرف ادبی اعتبار سے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی ایک اہم مقام رکھتی ہیں اور بعض صورتوں میں تاریخی مآخذ ہیں۔

مثنوی "قرآن السعدین" میں سلطان بغرا خاں اور اس کے بیٹے کیقباد کے مابین مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

مثنوی "مفتاح الفتوح" میں سلطان جلال الدین خلجی کی فتوحات کا حال ہے۔ سلطان نے اس مثنوی کے کمال کے اعتراف میں خسرو کو مصحف داری اور امارت کا عہدہ دیا تھا۔ اور تبھی سے وہ امیر خسرو کہلانے لگے تھے۔

"عشقیہ" نام کی مثنوی میں گجرات کی راج کماری دول رانی اور سلطان علاء الدین کے بیٹے خضر خاں کے عشق کی داستان ہے۔ مثنوی "نُہ سپہر" نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس میں نو ابواب ہیں۔ اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ ایک ہی مثنوی میں مختلف بحروں کو استعمال کرنا خسرو کی جدت ہے "نُہ سپہر" کا ایک باب ہندوستان سے متعلق ہے جس میں خسرو نے ہندوستان کی عظمت کے بیان میں اپنی شاعرانہ صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں اور لکھا ہے کہ ہندوستان کے علم و فن نے تمام ملکوں کے فنون سے زیادہ وسعت حاصل کی ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کے لوگ یہاں تحصیل علم کی

خاطر آتے ہیں۔ زباں دانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ملک کے باشندے دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم نے دیگر ممالک کے مقابلہ میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی ایجادوں میں شطرنج اور صفر بھی ہیں اور یہاں وید جیسی مقدس کتاب ہے جو کتاب، سیاست، معاشرت اور سنگیت کا نادر مرقع ہے ــــ سلطان قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر خسرو کو ہاتھی برابر تول کر روپے نذر کیے۔

تاریخی مثنویوں کے سلسلے میں خسرو کی آخری مثنوی "تغلق نامہ" ہے اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا بیان ہے۔ اس میں بعض ایسی باتوں کا بیان ہے جو کسی تاریخ میں درج نہیں ہیں گویا یہ تاریخی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس طرح خسرو نے شاعری کو تاریخ کے درجہ تک پہنچا دیا۔

نظم کی طرح نثر میں بھی حضرت امیر خسرو کی تصنیفات کو ایک اہم مقام حاصل ہے ــــ

"خزائن الفتوح" تین جلدوں میں ہے جو "تاریخ علائی" کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات کا حال درج ہے یہ تصنیف ۱۲۹۵ء سے ۱۳۱۱ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔

"اعجاز خسروی" خسرو کا وہ نثری کارنامہ ہے جس میں زبان و بیان کے اصول مرتب کئے گئے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں اس سے قبل کسی نے بھی نثر نگاری کے اصول و قواعد مرتب نہیں کیے تھے۔ یہ کتاب

بھی تین جلدوں میں ہے۔

"افضل الفوائد" میں خسرو نے اپنے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔

یہ تو حضرت امیر خسرو کی صرف چند مشہور فارسی کتابوں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ "سیر الاولیا" کے مولف امیر خورد نے لکھا ہے کہ خسرو نے ننانوے کتابیں تصنیف کیں۔ تقی واحدی نے اپنی کتاب "عرفات العارفین" میں بیان کیا کہ خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا اس قدر بھاشا میں بھی لکھا ہے، لیکن اس کا کہیں نام و نشان نہیں ـــــ اس کا مطلب غالباً یہی ہے کہ خسرو کا ہندی کلام اور تصانیف باقاعدہ کتابوں کی شکل میں نہیں ملتیں، اور خسرو کی زندگی اور فن کا یہ پہلو باقاعدہ تحقیق کا محتاج ہے۔

بہرحال اس نزاعی بحث سے قطع نظر ان کا جو ہندی کلام سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے اور جس کے امانت دار کتابوں کے کاغذی اوراق نہیں، بلکہ ہندوستانی عوام کے پرسوز دل ہیں۔ وہ کلام حضرت امیر خسرو کی عوامی مقبولیت، ان کی انسان دوستی، حب الوطنی، قومی یک جہتی اور عوامی زندگی سے ان کی گہری دلچسپی کی دلیل ہے مثلاً سیکڑوں سال سے ہندوستانی گھروں اور سماع کی محفلوں میں یہ منڈھا گایا جاتا ہے۔ ع

"کاہے کو بیاہی بدیس اے لکھی بابل موہے۔"

اگر حضرت امیر خسرو اس انداز کا ہندی کلام نہ لکھتے تو وہ اپنی نادر الکلامی اور سحر البیانی کے باوجود آج محض لائبریریوں اور کتب خانوں میں پڑھنے کی چیز رہ جاتے۔ تاریخ کا ایک جز ہوتے اور بس مگر اپنے ہندی کلام کے طفیل امیر خسرو زندہ ہیں ہندوستانی عوام کے

دلوں میں اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ تمدّن کی نمائندہ محفلوں میں ان کا شمار ان صوفی سنتوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی بانی کی ذریعہ تہذیب و ملّت کی تفریق کی دیواریں توڑیں اور انسان دوستی کا درس دیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کے ہندی کلام میں ان کی درباری زندگی کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ کوئی شاہی کر وفر نظر نہیں آتا۔ ہندی بھاشا میں تو وہ عوامی زندگی کے دکھ سکھ کی بات کرتے ہیں اور ایسی سادہ زبان استعمال کرتے ہیں جسے سب سمجھ سکیں۔ وہ دلچسپ انداز میں معاشرے کی رنگین تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور اسی لیے ان کی کہہ مکرنیاں، دو سخنے اور پہیلیاں عوام میں آج بھی اسی طرح مقبول ہیں جیسے پہلے تھیں۔

ترور سے اک تریا اُتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اسکے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا، بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی

(نیم کی بنولی)

فارسی بولے آئی نا ترکی سوچے پائی نا
ہندی بولے آرسی آئے مُنہ دیکھے جو اسے بتائے

(آئینہ)

بیسوں کا سر کاٹ لیا نا مارا نا خون کیا"

(ناخون)

پہیلوں کی طرح امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں بھی گھر گھر مشہور رہیں، اور عوام

آج بھی ان سے لطف لیتے ہیں ؎

"سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن !
ــــــ نا سکھی دیا"

"سرب سلونا، سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن !
ــــــ نا سکھی نون"

"وہ آوے تب شادی ہووے
اُس بن دُوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے اُس کے بول
اے سکھی ساجن !
ــــــ نا سکھی ڈھول"

کہہ مکرنیوں کی طرح، دو سخنے بھی ان کے مزاج کی اُپج ہیں۔ دو مختلف سوالوں کا ایک ہی جواب ہے

"سوداگر راچہ می باید؟ بوچے کو کیا چاہیئے؟
دوکان

شکار بچہ می باید؟ قوتِ مغز کو کیا چاہیئے؟
بادام

جوتا کیوں نہ پہنا؟ سموسہ کیوں نہ کھایا؟
تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا؟ وزیر کیوں نہ رکھا؟
دانا نہ تھا ـــــــ"

غرض امیر خسروؔ کے کلام میں ہندوستانی عوام کی زندگی ہے۔ ان کی دلچسپیاں اور محفل آرائیاں ہیں۔ ان کے غم ہیں، ان کی خوشیاں ہیں اور ان کے دلی جذبات کی بھرپور ترجمانی ہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ مگر حضرت امیر خسروؔ کے کلام کی تاثیر شراب کہنہ کی طرح بڑھتی ہی جاتی ہے۔ آج ان کی شہرت و عظمت عالمگیر ہو چکی ہے اس تشکیک، نفس پرستی اور خود غرضی کی دنیا میں ان کا کلام سوزِ یقین، روحانیت، عزم و عمل۔ انسان دوستی اور ایثار کے چراغ روشن کر رہا ہے۔ زندگی کا سفر نہ کبھی آسان تھا اور نہ آج ہے۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

لیکن اگر دل میں ایمان اور یقینِ کامل کی روشنی ہے تو ہر منزل آسان ہے یہی حضرت امیر خسروؔ کا پیغام ہے۔

غالبؔ اور اس کا عہد

(غالبؔ کی تحریروں کی روشنی میں)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے اس دور میں آنکھ کھولی جب ہندوستان ایک سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحران سے گزر رہا تھا۔ مغل شہنشاہیت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ جاگیردارانہ نظام روبہ زوال تھا۔ اگر ایک طرف مرہٹوں کا اثر و اقتدار بڑھتا جا رہا تھا تو دوسری طرف انگریزی سامراج کا سورج ابھر رہا تھا جس کی کرنیں پورے ملک پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ایک تہذیب اپنا تاریخی رول پورا کرنے کے بعد آخری ہچکیاں لے رہی تھیں۔ اور دوسری تہذیب قیامت خیز انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ قدیم و جدید اور اندھیرے اجالے کی کش مکش اور متضاد قوتوں کے ٹکراؤ کا آہنگ غالبؔ کے لب و لہجہ اور اشعار میں صاف سنائی دیتا ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس دور میں عمائدین ملک کس بے اطمینانی کا شکار تھے اس کا اندازہ غالبؔ کی اس تحریر سے ہو سکتا ہے۔

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر ہوا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت پر کئی برس رہا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا رُخ کیا۔ راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کی لڑائی میں مارا گیا۔ نصیر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جنرل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈیر ہوا ایک ہزار روپیا ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سال کی جاگیر حین حیات پائی تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہوا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔"

یہی نقدی پنشن کی صورت میں غالبؔ کے حصّہ میں آئی اور وہ جیس کے۔

امراد کا پیشہ سولیشنت سے سپہ گری تھا۔ اس نے کبھی تلوار نہ اٹھائی۔ اس آئینہ تحریر میں صاف نظر آتا ہے کہ جاگیردارانہ طبقہ کی طرح عملی اور سیاسی زندگی سے بے تعلق ہو گیا تھا۔ ملک سیاسی خلفشار سے دوچار تھا۔ بدیسی سامراج کی جڑیں سرزمین ہندوستان میں گہری ہوتی جارہی تھیں۔ مگر جاگیرداری کی چھاتوں میں پلنے والے اپنی ہی دنیا میں رہتے تھے۔

معاشرتی طور پر ہندوستانیوں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ مرزا غالب کی تحریروں میں مشترکہ تہذیبی زندگی کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جب یہ جانا کہ تم منشی بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ تمہارے دادا بہادر نجمت خاں میں میرے نانا مرحوم خواجہ غلام حسین خان کے رفیق تھے جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پر دادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے جو کنھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعوا کیا ہے تو منشی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی عمران کی باہم شطرنج، اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس لئے جب چاہتے تھے چلے

جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کٹھا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑایا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اگھا کر جمع کرتا تھا۔"

عام زندگی میں ہندو مسلمانوں کے میل جول اور تہذیبی ہم آہنگی کی کبھی نہ مٹنے والی ایسی تصویریں غالب کی تحریروں کا اہم حصہ ہیں ہندو بھی تھے اور نصرانی بھی۔ ان کا یہ فقرہ اس دور کی تہذیب کی ایک انمول دین ہے۔

"میں بنی آدم کو مسلمان، یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔" بین الاقوامی یگانگت کا یہ جذبہ ان کے اشعار میں موجزن ہے ؎

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

دہلی میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی ایک خوبصورت تصویر ان کے ایک خط میں :

"اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے۔ پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لیکر اہل حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں۔ دو تین مہینے تک وہیں رہتے ہیں مسلمین، ہندو، دونوں فرقے۔ شہر میں دوکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔"

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دہلی میں خاص طور پر مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا مگر عوام نے اس بدیسی سیاست کا اثر قبول نہیں کیا۔ مرزا اپنی تصنیف "دستنبو" میں لکھتے ہیں :

"ہیش داس نے مجھے وہ آب حیات بخشا جسے سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا اور جو دیکھا ہے بن کہے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس نیک طینت نے شہر میں مسلمانوں کی آبادی کے سلسلے میں کوئی کوشش نہیں اٹھا رکھی۔ میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں ہیرا سنگھ

جو ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اس نیم ویران اور نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیوجی رام برہمن جو ایک جوان دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دلریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ اور اپنی بساط کے بہ قدر میری فرمانبرداری کرتا اور میرے کام بناتا ہے۔ اس کا بیٹا بال مکند بھی جو ایک نیک طینت اور پرہیزگار نوجوان ہے، اپنے باپ کی طرح میری فرمانبرداری میں مستعدی اور غمگساری میں یکتا ہے دور دست دوستوں میں آسمان مہر و مروت کا وہ ماہ کامل شیوا زبان ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے۔ اور چوں کہ شاعری میں مجھے اپنا استاد کہتا ہے، اس کا کلام جملہ خداداد اوصاف کے ساتھ میرے لئے سرمایۂ ناز ہے فرط محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے اور مرزا تفتہ کا خطاب دیا ہے۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی تحریروں میں جس دور کی تصویر ہمارے سامنے ابھرتی ہے، وہ دور اگرچہ افراتفری کا دور تھا مگر انسانیت اور شرافت باقی تھی۔ عزت نفس کا احساس تھا اور فرد کی شخصیت سماج کے ہنگامے میں ضم ہو کر نہیں رہ گئی تھی۔ اور ان قدروں کے سب سے اہم علم بردار تھے خود مرزا غالبؔ انھوں نے بادشاہ، نوابوں اور حکومت وقت کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی، دربار داری اور نوکری کی۔ مگر کبھی عزت کا سودا نہیں کیا ہے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا !

دہلی کالج کی ملازمت کو محض اس لیے ٹھکرا دیا کہ مسٹر ٹامسن نے ان کا خاطر خواہ استقبال نہیں کیا۔ انگریزی سرکار سے بھی اگر چاہا تو مرتبہ اور عزت ؎

عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدہ کا چاہیئے قیام
ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

نواب رام پور سے وہ اس لیے خوش تھے کہ ان سے ملازمت کا نہیں، دوستی کا معاملہ تھا۔ دربار شاہی میں ان کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اعتراف خود ان الفاظ میں کیا ہے:

"جب بادشاہ دلی نے مجھے نوکر رکھا اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ کی مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز جدید پر لکھی: مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی ناظر حکیم کسی سے توقیر کم نہ تھی۔ مگر اس توقیر کے باوجود اس مقطع میں جو طنزیہ کیفیت ہے

Scanned by CamScanner

اسے اہل نظر سمجھ سکتے ہیں۔ اور مقطع سے زیادہ اہم ہے اس غزل کا مطلع ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یہ وہ زمانہ ہے جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نام کا بادشاہ تھا۔ شہنشاہیت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ امرائے سلطنت اور دربار سے وابستہ لوگوں کی حالت زار تھی۔ انھیں باعزت اور غیور زندگی گزارنا دشوار تھا، غالب جیسے باکمال کے لئے صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا — اس سماجی ابتری کی ایک تصویر غالب کے ان اشعار کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہے جو انہوں نے بہادر شاہ کو خطاب کر کے کہے ہیں ؎

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
مری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — ہے جہاں کا اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

سخاوت، غریب پروری اور دریا دلی مغلیہ تہذیب کا جزو تھیں۔ بہادر شاہ چراغ شاہی کو گل ہوتے دیکھ رہا تھا مگر مقدور بھر ان روایات اور اقدار کا احترام کرتا تھا۔ روایات کے احترام کا یہ جذبہ یہ قدر ظرف شرفائے وقت کے حصے میں بھی آیا تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد مرزا غالبؔ ان روایات کے آخری پاسدار تھے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بیان کے مطابق مرزا غالبؔ کی سخاوت اور دریا دلی کی یہ تصویر پردۂ ذہن پہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ مرزا کسی سوچ میں غرق ہیں کہ حالیؔ ان سے ہم کلام ہیں:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

"آداب عرض قبلہ مرزا صاحب۔"

"آؤ میاں حالیؔ آؤ، آج بہت دن میں آئے۔"

"جی ہاں، تاخیر کے لیے شرمندہ ہوں، آپ کا مزاج کیسا ہے۔"

"اچھا ہوں۔"

"آج آپ کچھ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں ابھی ابھی دربار گورنری سے لوٹا ہوں۔ اور حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا (کھانسی)"

"مرزا صاحب! پانی پیش کروں۔"

"ہاں تمہیں تکلیف کرو۔ کلو ذرا بازار گیا ہے۔"

"مرزا صاحب! گستاخی معاف۔ وہ خلعت ......"

"بھائی وہ خلعت وغیرہ تو کلو بازار لے گیا ہے۔ اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں۔"

"ارے میاں: ہم درویش آدمی، مجھے اس خلعت اور جواہر سے کیا سروکار۔ یہ تو میں عزت کی خاطر قبول کرتا ہوں اور جس کا حصہ ہوتا ہے اسے پہنچا دیتا ہوں۔"

"اچھا اب میں سمجھا کہ یہ ادھر لفٹنٹ کے چپراسی اور جمعدار کیوں بیٹھے ہیں۔"

"میاں دستور کے مطابق اپنا انعام مانگنے آئے ہیں۔ وہ بھی اسی دن کے لیے آس لگائے رہتے ہیں۔ مگر

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

کلو بازار سے روپیا لے آئے تو ان حقداروں کو ان کا حق دے کر اپنی گلوخلاصی کروں۔"

"مرزا صاحب! گستاخی معاف: میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کا ہاتھ اب بھی اس قدر تنگ ہوگا۔ اب تو آپ کی آمدنی ....."

"ہاں شکر ہے۔ کل ملا کر ڈیڑھ سو روپیا ماہوار ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر بھی ......"

"بھائی میں کیسے گوارا کروں کہ کوئی میرے دروازے سے خالی ہاتھ جائے قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بہ قدر ایک ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت

کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جانکلا، کبھی مصر جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

"سبحان اللہ۔"

"خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار ــــ میرے معاملات، کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے، اور خود در بدر بھیک مانگے۔ وہ میں ہوں۔"

"نہیں مرزا صاحب نہیں، میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔"

"بھائی میں کون ہوں کسی کو کچھ دینے والا، ضرورت مند آتے ہیں اور خدا کی طرف سے میرے پاس ان کے لئے جو کچھ مقرر ہے لے جاتے ہیں۔"

"بیشک، بیشک۔"

انسانیت اور شرافت کا ایک عہد تھا جو مرزا غالب پر ختم ہو گیا اس عہد اور پر آشوب دور کی جھلکیاں ان کی نثر و نظم میں جا بجا ملتی ہیں۔ وہ کوئی سیاست داں تھے نہ مورخ، وہ ایک شاعر تھے اور درد مند دل رکھتے تھے ۱۸۵۷ کا خونیں انقلاب ان کے سامنے آیا اور انھوں نے دہلی کی تباہی پر خون کے آنسو بہائے۔ انھوں نے وہی لکھا جو محسوس کیا۔

"پیر کے دن دوپہر کے وقت ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک قلعہ کے در و دیوار اور دہلی کی فصیلیں لرز اٹھیں اور زلزلہ چاروں طرف پھیل گیا۔ اندرون قلعہ قتل اور کوچہ و بازار میں سواروں کی دوڑ بھاگ۔ اور شہر میں پیادوں کے پے بہ پے پہنچنے کا

شور بلند ہوا مٹھی بھر خاک بھی نہ رہی جو گل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو۔ اور کسی باغ کا ایک کونہ بھی نہ تھا جو بے برگ و باری کے سبب بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا ہو۔ ہائے وہ عاقل و عادل نیک طینت و نیک حاکم اور وہ خوبصورت نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی کی طرح روشن اور جسم کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے، اور جیسے وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو دیکھا بھی نہ تھا، جن کے ہنس مکھ۔ چہرے پھولوں کو شرماتے تھے، اور جن کی سبک گامی چکور کی چال پر حرت گیری کرتی تھی اکہ سب دفعتاً خون کے بھنور میں جا ڈوبے۔"

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت کی جو آگ بھڑکی تھی اس کے شعلے اور تیز ہوئے اس کا اثر دہلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر مختلف صورتوں میں ہوا، مرزا غالب کے الفاظ ہیں۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار گیا۔۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ـــــ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے ـــــ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے ـــ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر مرض میں طاقت نہ پائی۔"

اور وہ سب سے بڑا لشکر تھا جس نے بے گناہوں کے خون سے اپنی تیغ ہوس کی آگ بجھائی۔ دہلی اور اہل دہلی کی تباہی پر مرزا کا یہ قطعۂ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ؎

بسکہ فعال ما یرید ہے آج | ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے | زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے | گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک | آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ | سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم | ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب | کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

مرزا غالب نے دہلی کی تباہی پر اپنے خطوں میں گویا خون کے آنسو روئے ہیں وہ خود روئے ہیں اور اوروں کو رلایا ہے۔ ان کے قلم نے ایک ایک گلی کوچے کی بربادی کا ماتم کیا ہے اور ایک ایک ویرانے کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کیا ہے۔ دہلی کی تباہی اور تباہ حال زندگی کی کتنی سچی تصویر ہے اس خط میں:

"شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اردو بازار، خانم کا بازار۔ کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ برسات کھل کر برسا۔ اب تیشہ اور رکمند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے

موت ارزاں ہے، سونے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ ۱۲ سیر، گیہوں ۱۳ سیر، چنا ۱۶ سیر، گھی ایک سیر ترکاری مہنگی ــــ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات کہ کنوار کا مہینہ جسے جاڑے کا دورا کہتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز اور لُو چلتی ہے، جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔ خاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بلا مبالغہ صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو، کا مکان ہو جائے۔ کشمیری دروازے کا یہ حال ہے کہ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا ہے ــــ پنجابی کٹرہ، دھوبی کٹرہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکان، صاحب رام کا باغ، حویلی ــــ ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا ہے۔ اب جو کنویں جاتے رہے، پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر نہ بازار، نہ نہر ــــ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا ــــ یہ پانچوں باتیں اب نہیں تو دلی کہاں ــــ مسجد جامع واگذشت

ہوگئی۔ چنبلی قبر کی طرف سیڑھیوں میں کنجڑیوں نے دکانیں بنالیں۔"

مرزا غالب کو دہلی سے عشق تھا اور اس شہر کی تہذیبی زندگی کا ہر گوشہ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے، مگر ضرورتاً انھیں اس شہر سے باہر بھی جانا پڑا ہے

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

انھوں نے پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اور دورانِ سفر میں لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا۔ نواب رام پور سے دوستانہ تعلقات اور اصلاحِ کلام کے سلسلے میں رام پور بھی گئے۔ ان کی تحریروں میں ضمنی طور پر جن شہروں کا ذکر آیا ہے اس سے وہاں کی معاشرت اور تہذیبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ رام پور کا ذکر کس محبت سے کیا ہے:

"رام پور میرے لیے دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا کوسی نام ہے اس کا بے چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں ہے کہ آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔"

ایک خط میں میر وزیر علی خاں بلگرامی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے جو دہلی میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے:

"حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ آنکھیں
ان کے حسن صورت سے روشن ہوگئیں اور دل ان کے حسن سیرت
سے خوش ہوگیا۔ واہ خاکِ پاک بلگرام! میں نے وہاں کے جس
بزرگوار کو دیکھا بہت اچھا پایا۔"

اور لکھنؤ ــــــ !! لکھتے ہیں ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد لکھنؤ کے بارے میں میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"بھائی! لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان نہ ہوگا۔ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین نہ تھا۔ امرا و شرفا کی ملاقاتیں بہ قدرِ رتبہ و تعظیم و توقیر، پنشن کی تقسیم علی العموم آبادی کا حکم، عام لوگوں کو کمال لطف و زندگی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔"

مرزا غالبؔ نے گلشن کشمیر کا ذکر اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔

اور اسے خدائے سخن میر تقی میر کے رنگا رنگ دیوان سے نسبت دی ہے ؎

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اور بنارس کی تعریف میں تو انھوں نے مثنوی چراغ دیر لکھی ہے جس کے اشعار بنارس کے حسن اور اس شہر کے تمدن اور تہذیب کی منہ بولتی تصویریں ہیں ؎

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور
خس و خارش گلستا نست گوئی
غبارش جوہر جانست گوئی
بیاباں در بیاباں لالہ زارش
گلستاں در گلستاں نو بہارش

۱۸۲۶ء میں غالب کلکتہ گئے اور وہاں تقریباً دو سال قیام کیا، اس عرصے میں انھیں اس جدید تمدن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جو قدیم جاگیر دارانہ تہذیب پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا تھا پنشن کے مقدمے میں ناکامی اور ادبی چشمکوں کے باوجود غالب نے کلکتہ کا ذکر بڑے دل نشین انداز میں کیا ہے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ وشیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

غالبؔ کلکتہ کی معاشرت سے خاطر خواہ متاثر ہوئے اور ان کی تحریروں میں تازگی، شگفتگی اور وسیع النظری پیدا ہوئی۔ اس امر کا اظہار اس وقت ہوا جب سرسید احمد خاں نے آئین اکبری کی تقریظ ان سے لکھائی۔ غالبؔ نے ایک روشن خیال مفکر کی طرح جدید زندگی کی ان برکتوں کا خیر مقدم کیا ہے جو بالآخر ایک نئے نظام کی بنیاد بننے والی تھیں، انھوں نے برملا کہا کہ جدید سائنس کی ایجادات اور نئے قوانین کے سامنے پچھلے سب آئین تقویم پارینہ ہو گئے ہیں۔

نغمہ ہائے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ　　شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار　　گشتہ آئین دگر تقویم پار

غالبؔ اپنے شعور کے آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہے تھے اور الہامی انداز میں نغمہ سنج تھے:۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

شہیدِ وطن — اشفاق اللہ خاں

شہیدوں کے مزاروں پر جمیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی نام ونشاں ہوگا
بہت ہی جلد ٹوٹیں گی غلامی کی یہ زنجیریں
کسی دن دیکھنا آزاد یہ ہندوستاں ہوگا

یہ اس شہیدِ وطن اشفاق اللہ خاں کی پیشین گوئی ہے جسے اپنی موت پر ناز تھا ۔

زندگی بعدِ فنا تجھ کو ملے گی حسرت
تیرا جینا ترے مرنے کی بدولت ہوگا

اس امر شہید کی زندگی ایک رقصاں و خنداں شعلے کی طرح گزری جس نے انگریزی سامراج کو بھونک ڈالنا چاہا اور اس مقدس کوشش میں وطن کی قربان گاہ پہ بھڑک کر خاموش ہوگیا ۔

"تنگ آ کر ہم بھی ان کے ظلم کی بیداد سے
چل دئے سوئے عدم زندانِ فیض آباد سے

پیدائش ــــــ ۲۲ ، اکتوبر ۱۹۰۰ء
کاکوری کیس ــــــ ۹، اگست ۱۹۲۵ء
پھانسی ــــــ ۱۹، دسمبر ۱۹۲۷ء

فیض آباد جیل

یہ تین تاریخیں اشفاق اللہ کی زندگی کی تین علامتیں ہیں۔ منزلِ کاروانِ آزادی کے تین سنگِ میل ہیں۔ آثارِ اشفاق کی تلاش کشاں کشاں مجھے اس سر زمین پر لے گئی جہاں اس شعلے نے فروغ پایا تھا اور جہاں وہ سپردِ خاک ہے ـــ شاہ جہان پور ریلوے اسٹیشن سے نکلتے ہی شہیدِ وطن اشفاق اللہ خاں روڈ ہے جس کی چہل پہل اور شب و روز کی بیداری اشفاق کی بے تکان زندگی کی ہر لمحہ یاد دلاتی ہے۔ اشفاق اللہ خاں روڈ کے ایک سرے پہ اشفاق نگر، پولیس چوکی اشفاق کی طرح اس شہر کی نگراں ہے۔ اور پھر ہے محلہ اشفاق نگر۔ یہیں ایک معزز پٹھان گھرانے میں اشفاق نے آنکھ کھولی۔ اس بڑی حویلی میں اب تک اشفاق اللہ کے قہقہے گونجتے ہیں جس کا ایک حصہ ابھی تک ناپختہ ہے قدیم وضع کی بیٹھک میں وہ کچا کوٹھا آج تک اس کا گواہ ہے کہ یہاں اشفاق اللہ اور اس کے انقلابی ساتھی آزادیٔ وطن کے خواب دیکھا کرتے تھے اور یہیں ان شعلہ خو جوانوں کا اسلحہ رکھا رہتا تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں اشفاق نے خود لکھا ہے۔

"جب میں بچہ تھا، ایک مولوی صاحب خدا انھیں غریقِ رحمت کرے میرے بھائیوں کو پڑھایا کرتے تھے مجھے بھی ان کے پاس پڑھنے کے لیے

بٹھا دیا گیا۔ جنگ کے حالات پڑھنے سے مجھے بہت دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی جب عملی شکل اختیار کر لیتی تو مولوی صاحب مجھے کان پکڑ کر اٹھایا بٹھایا کرتے تھے۔ تھی تو سزا۔ مگر کسرت کا کام کرتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو زمین جھنکا دیتا تھا۔ محلّے میں بھی جنگ آزمائی ہوتی رہتی تھی کیونکہ میں ایک جنگجو لڑکا تھا۔ غرض مارپیٹ کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔"

اشفاق اللہ خاں جب مشن اسکول کے ساتویں درجے میں پڑھتے تھے تو مین پوری سازش کیس کے سلسلے میں سرکاری گواہ نے ان کے اسکول کے ایک طالب علم راجہ رام کو گرفتار کرایا اور رام پرساد بسمل اور کئی اور لڑکے بھی گرفتار کر لیے گئے اس واقعہ نے اشفاق اللہ کو چونکایا اور اس کے دل میں کچھ کر گذرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے:

"جب میں آٹھویں درجے میں تھا۔ میرے کورس کی انگلش کی کتاب میں دو سبق تھے۔ ایک تو "لو آف کنٹری" سر والٹر اسکاٹ کی نظم، اور دوسرا سبق "ہوریشین" کا قصہ تھا جس میں اس نے ایک اسپیچ دی تھی جبکہ ملک برعظیم نے چڑھائی کی تھی اور اس نے کہا تھا کہ اگر پل توڑ دیا جائے تو ندی کو پار کر کے فوج نہیں آسکتی اور نہ کوئی دوسرا راستہ ہے۔ میں جاتا ہوں اور اس تنگ راستے میں مع تین ساتھیوں کھڑے ہو کر لڑوں گا اور پُل ندی میں توڑ کر ڈال دیا جائے ــــ غرضکہ ایسا ہی ہوا اور روم بچ گیا ــــ مجھے حب الوطنی کے پلیٹ فارم پر لانے والی اور وطن کی محبت کی آگ دل میں بھڑکانے والی سب سے اول یہی نظم اور یہی سبق تھا۔"

اور پھر اشفاق اللہ نے حب الوطنی کا یہ سبق ایسا پڑھا کہ اپنا تن، من، دھن سب کچھ وطن پر قربان کر دیا۔

حب الوطنی کا جذبہ تو ان کے دل میں پیدا ہو ہی چکا تھا۔ مولوی صاحب کی تعلیم اور پھر خلافت تحریک کی مقبولیت نے اس جذبے کو پروان چڑھایا اور جب کرانتی کاریوں کے نیتا پنڈت رام پرساد بسمل سے ان کی ملاقات ہوئی تو گویا اشفاق کے بے چین ارادوں کو ایک سمت مل گئی اور وہ انقلابی بن گئے۔ بسمل اور اشفاق کی دوستی نے انقلابیوں میں ہندو مسلم اتحاد کی نئی مثال قائم کی۔ مادرِ وطن کے یہ دونوں سپوت ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ اشفاق بسمل کو رام کہہ کر پکارتے تھے۔ اور بسمل اشفاق کو کرشن کہا کرتے تھے۔ انقلابی مہموں میں اشفاق نے بے مثال کارنامے انجام دیئے ان کے ایک ساتھی شری شچیندر ناتھ بخشی نے لکھا ہے۔

”وہ لمبے چوڑے پکے کھلاڑی اور شکیل وجیہہ انسان تھے۔ ان کا وزن ۱۷۵ پونڈ تھا۔ پھر بعد میں جیل جا کر ۲۰۳ پونڈ ہو گیا تھا۔ نہایت پرکشش اور بھاری بھرکم ہونے کے باعث وہ بھیڑ میں الگ پہچانے جاتے تھے۔ جب کبھی ہم لوگ بندوق یا رائفل لے کر چلتے تو اشفاق اللہ خاں ہم لوگوں کے درمیان راجہ صاحب یا کنور صاحب بن جایا کرتے تھے اور ہم لوگ درباری یا شکار پارٹی کے افراد بن جایا کرتے تھے۔ کئی بار ہم نے اس طرح سوانگ بھر کر پولیس کو چکمہ دیا تھا۔“

انقلابیوں کے اس دل نے ۹؍اگست ۱۹۲۵ کو لکھنؤ کے قریب کاکوری میں چلتی ریل روک کر جو خزانہ لوٹا تھا اس سے انگریزی سرکار چوکنی ہو گئی اور حکومت نے جوڑ توڑ کر کے سب انقلابیوں کو پکڑ لیا اور کچھ دن کے لیے ہی سہی — آزادی کے کارواں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اشفاق اللہ اس

دوراندیشی کی بنا پر اس مہم کے حق میں نہیں تھے۔ مگر جب سب کی یہی رائے ہوئی کہ انقلابی دل کے اخراجات پورا کرنے کے لیے سرکاری خزانہ لوٹا جائے تو اشفاق اللہ نے بھی کمر کس لی اور اس مہم میں سب سے نمایاں کام کیا یعنی اپنے قوی ہاتھوں سے خزانے کا صندوق توڑا۔ مگر ہوا وہی جس کا اشفاق اللہ خاں کو اندیشہ تھا کہ پولیس نے اپنے ہتھکنڈے استعمال کرکے اس خفیہ سازش کا پتہ لگا لیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اچانک انقلابیوں کے گھروں پر چھاپے مارے۔ اشفاق کے گھر بھی پولیس نے چھاپہ مارا۔ ان کی بڑی بھابی صاحبہ کے بیان کے مطابق وہ اس وقت گھر ہی میں تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ پولیس کی آمد کی خبر پا کر اطمینان سے اُٹھے۔ سب سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے زنان خانے کی چھت پر چڑھے اور یہ جا وہ جا۔ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئے مگر اس بار اشفاق کے قدم اپنے گھر سے ایسے نکلے کہ پھر گھر میں ان کی لاش ہی آئی۔ ان کے یہ اشعار ان کی داستانِ دل کے ترجمان ہیں ؎

وطن میں آہ غریب الدیار ہو کے چلے
نشانۂ ستمِ صد ہزار ہو کے چلے!
پھرائے دیکھئے ہم کو کہاں کہاں تقدیر
اسیرِ گردشِ دلیل و نہار ہو کے چلے
وطن نہ دے ہمیں ترکِ وفا کا تو الزام
کہ آبرو پہ تری ہم نثار ہو کے چلے

اشفاق گھومتے گھامتے بنارس پہنچے اور وہاں سے بہار چلے گئے اور ڈالٹن گنج میں ایک ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر میں ملازمت کرنے لگے وہاں

انھوں نے اپنا تعارف متھرا کے ایک کائستھ کی حیثیت سے کرایا۔ تقریباً آٹھ ماہ ملازمت کی۔ پھر اس مصنوعی زندگی سے تنگ آکر نکل کھڑے ہوئے۔ دہلی پہونچے۔ جہاں ان کے ایک ہم سبق دوست مل گئے جو شاہجہاں پور ہی کے پٹھان تھے۔ انھوں نے انعام کے لالچ میں پولیس کو مخبری کر دی اور اشفاق گرفتار ہو کر سنٹرل جیل لکھنؤ پہنچ گئے۔

ایام اسیری میں ان کی طبع رسا کے جوہر کھلے ان کی وہ غزلیں جو انھوں نے ایام اسیری میں کہی ہیں۔ سوز و گداز اور ایک انقلابی روح کے کرب اور اضطراب کی بہترین مثالیں ہیں اور انھیں اس دور کے شعری ادب کا وقیع حصہ تصور کیا جانا چاہیئے۔ داخلی جذبات اور خارجی کیفیات کو اشفاق اللہ خاں حسرت نے اپنی غزلوں میں جس طرح بیان کیا اس سے غزل کے دامن کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اشفاق کی قدرت بیان کا بھی۔ وہ سرتاسر انقلاب کی بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن کہیں نعرہ بازی اور کھوکھلے پن کا شائبہ نہیں ان کی غزلوں میں جذبات کا ایک سمندر ہے جو موجیں مار رہا ہے اور الفاظ ہیں کہ جذبات کے پیکر تراشتے چلے جاتے ہیں۔ ؎

سنائیں غم کی کسے کہانی ہمیں تو اپنے ستا رہے ہیں
ہمیشہ صبح و مساء وہ دل پر ستم کے خنجر چلا رہے ہیں

رنگت وہ اب کہاں ہے نسرین و نسترن میں
اجڑا ہوا پڑا ہے، کیا خاک ہے وطن میں
کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاک وطن کفن میں

صیادِ ظلم پیشہ آیا ہے جب سے حسرتؔ
ہیں بلبلیں قفس میں زاغ و زغن چمن میں
شہیدانِ وطن کا خون اک دن رنگ لائے گا
چمن میں پھوٹے نکلے گا یہ برگِ ارغواں ہوکر

بہار آئی ہوئی شورش جنونِ فتنہ ساماں کی
الٰہی خیر کرنا تو مرے جیب و گریباں کی

صحیح جذبات حریت کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زِنداں کی
مثالِ قیسِ دیوانہ کسی لیلیٰ کی خاطر میں
ہمیشہ ٹھوکریں کھایا کیا کوہ و بیاباں کی

لیلائے آزادی کا یہ دیوانہ اگر گیسوئے شاعری سنوارتا تو نہ جانے اس کے حسن میں کتنی دلکشی پیدا ہوتی۔ مگر شاعری تو اس کے لیے ایک رہگذر تھی۔ اسے تو آسمانِ شہادت کا آفتاب بننا تھا۔ اور حیاتِ ابدی اسے دار و رسن سے آواز دے رہی تھی۔ لکھنؤ سنٹرل جیل اور زندانِ فیض آباد سے مختلف لوگوں کے نام جو خطوط اور پیغامات اشفاق نے لکھے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ میں اس مقصد اور نصب العین کی تڑپ ہے جس کے لیے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی ۲۲، جولائی ۱۹۲۷ء کو فیض آباد جیل سے اپنے بڑے بھائی کو جائداد کی ضبطی کا حکم صادر ہونے

پر اشفاق اللہ نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"میری جائداد ہی کیا ہے جو ضبط ہوگی۔ میرے خیالات، میری کتابیں میری جان، میری آزادی میری جائداد ہے جو گورنمنٹ نے ضبط کرلی ہے۔ اب دیکھئے کیا نیت ہے، خیر خدا کا شکر ہے۔ اب آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ میری وجہ سے جو بھی آپ لوگوں کو دکھ اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں انھیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیجئے اور خدا سے دعا کیجئے اور مجھے معاف فرمایئے۔ ایک شعر لکھے دیتا ہوں ؎

وہ آمادہ ہیں بعدِ دفن بھی تربت مٹانے پر
کرم فرما کی باقی ہیں کرم فرمائیاں اب تک

اپنی والدہ محترمہ مظہر النساء بیگم کے نام اشفاق اللہ کے آخری خط کے اقتباسات نہایت روح فرسا ہیں اور اشفاق کے عظیم کردار کو پیش کرتے ہیں۔ "زندان فیض آباد
پھانسی کی کوٹھری
۱۵، دسمبر ۲۷ ۱۹ء

دکھیا اور بوڑھی ماں کی خدمت میں اس کے مرتے ہوئے فرزند کا سلام پہنچے۔ جو اسی ہفتے اس دارِ فانی کو الوداع کہہ کر اس ملکِ جاودانی کو پہونچ جائے گا۔ جہاں اس سے پہلے بھی سب جاچکے ہیں اور ہر ذی روح اس کے بعد ضرور جائے گا ؎

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے"

خط طویل ہے جس میں خاندان کے دوسرے افراد سے بھی خطاب کیا گیا ہے اور صبر و شکر کی تلقین نہایت بلیغ الفاظ میں کی ہے۔

"ہم رضا کار ہیں ہم پر ہے بہر حال یہ فرض
شکر حق لب پہ رہے شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا
فکرِ امروز ہی رکھیں غم فردا نہ کریں"

تم سب کو غم اٹھانے کے لیے انتخاب کیا اور مجھے منصورِ حق بنانے کو چن لیا۔ اگر تم کو گریۂ یعقوب عطا کیا تو مجھ کو سنت یوسفی ادا کرنے کو پکارا۔ اگر تم کو ماتم کناں مثل خاندانِ نبوی بنانا ہی چاہا بتا دیا اور مجھے بتبع حسینؑ شہید تیغ جفا کے خطاب سے نوازا۔ اس کی شان نرالی۔ اس کی ادا انوکھی، ہر جگہ نئے رنگ میں ہر طرف نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔"

اشفاق اللہ خان نے پھانسی سے چند روز پہلے برادرانِ وطن کے نام ایک پیغام لکھ کر سورگ واشی گنیش شنکر ودیارتھی کے پاس بھیجا تھا۔ اشفاق کی یہ تحریر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف اپنے مسلک کو واضح کیا ہے۔ بلکہ اہل وطن کو متفق و متحد ہونے اور ہر قیمت پر آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی ہے۔ انھیں فرض قومی سے آگاہ کیا ہے اور وقت کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کی اس تحریر میں ان کے دل کی تڑپ اور عظیم مقاصد کی آگ ہے۔ یہ پُرسوز تحریر ان کا نثری شہ پارہ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ان کے خونِ جگر سے لکھا ہوا ہے۔ چند اقتباسات ؎

"برادرانِ وطن کی خدمت میں ان کے اس بھائی کا سلام پہنچے جو ان کی عزت و ناموس کی خاطر فیض آباد جیل میں قربان ہو گیا۔ آج یہ پیغام میں برادرانِ وطن کو بھیج رہا ہوں اس کے بعد مجھ کو تین دن اور چار راتیں گذارنی ہیں اور پھر میں سو جاؤنگا آغوشِ مادرِ وطن میں ہم لوگوں پر جو جارحیرم لگائے گئے تھے وہ اس صورت میں پبلک کے سامنے لائے گئے کہ بہت سے لوگ جو غیر تعلیم یافتہ یا حکومت کے دسترخوان کی ہڈیاں چچوڑنے والے تھے ہمیں ڈاکو، خونی اور قاتل کے لقب سے پکارا گئے ہیں آج اس کوٹھری میں بیٹھا ہوا بھی خوش ہوں اور اپنے ان بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور کہوں گا۔

مرگیا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سنا
آپ کی جان سے دور آپ سے شکوہ ہے مجھے

برادرانِ وطن! میں اسی پاک و مقدس وطن کی قسم کھا کر کہوں گا کہ ہم ننگ و ناموس پر قربان ہو گئے ہیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہ تھی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ نت نئے مظالم ہو رہے ہیں اور غریب ہندوستانی ہر حصۂ ملک اور خطۂ دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ نہ کہیں ٹھکانہ ہے، نہ سہارا۔ قصہ مختصر کہ ہمارا وطن بھی ہمارا نہیں۔"

اس کے بعد اس پیغام میں اشفاق اللہ خاں نے انگریز کے مظالم اور جلیانوالا باغ کے انسانیت سوز جیسے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے تبلیغ اور تفرقہ انگیز تحریکوں کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے بلکہ بدیسی سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں لکھا ہے۔

"میں اپنے ہندو اور مسلمان بھائیوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب

ڈھونگ ہے۔ جو سی۔آئی۔ڈی۔ کے خفیہ خزانے سے رچا گیا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے لوگ اس سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ بس عوام کو آنکھیں کھول کر اتباع کرنا چاہیئے۔ بھائیو! تمھاری آپس کی پھوٹ تم دونوں میں سے کسی کے لیے بھی سود مند ثابت نہ ہوگی۔ اور یہ غیر ممکن ہے کہ سات کروڑ مسلمان شدھ کر لیے جائیں۔ اور ایسے ہی یہ بھی مہمل بات ہے کہ بائیس کروڑ ہندو مسلمان بنائے جائیں۔ مگر ہاں یہ آسان ہے اور بالکل آسان ہے کہ سب مل کر غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیں۔

اے وہ قوم جس کا کوئی جھنڈا نہیں۔ اے وہ قوم! کہ تیرا وطن تیرا وطن نہیں۔ اے وہ قوم! کہ جو دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے رحم کی درخواست پر نظر رکھتی ہے۔ تیری اپنی غلطیوں کا یہی نتیجہ ہے کہ آج تو غلام ہے اور پھر بھی وہی غلطیاں کر رہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تو غلامی کا دھبّہ چھوڑ جائے گی کہ جو بھی سرزمین ہند پہ قدم رکھے گا غلامی میں رکھے گا اور غلام رہے گا۔

اے خداوند قدوس! کیا کوئی ایسا سویرا نہیں آئے گا کہ جس کی صبح کو تیرا آفتاب آزاد ہندوستان میں چمکے اور فضائے ہند آزادی کے نعروں سے گونج اٹھے گی۔"

اشفاق اللہ خاں نے اپنے پیغام میں ملک کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی اور زوال کے بنیادی اسباب تک ان کی نظر پہونچی لکھتے ہیں۔

میرا دل ہمیشہ غریب کسانوں اور دکھیا مزدوروں کی لیے دکھی رہا ہے۔ اپنے ایام فراری میں بھی اکثر ان کی حالت دیکھ کر رویا کیا ہوں۔

کیوں کہ مجھے ان کے ساتھ دن گذارنے کا موقع ملا ہے میرا بس ہو تو میں دنیا کی ہر چیز کو ان کے لیے وقف کر دوں۔ ہمارے شہروں کی رونق ان کے دم سے ہے۔ ہمارے کارخانے ان کے دم سے آباد ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ غریب کسان بارش کے موسلا دھار پانی اور جیٹھ بیساکھ کی تپتی ہوئی دوپہریوں میں کھیتوں میں جمع ہو کر جنگل میں منڈلاتے ہوئے ہماری خوراک کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ جو وہ پیدا کرتے ہیں۔ جو وہ بناتے ہیں اس میں ان کا حصہ نہیں ہوتا اور ہمیشہ دکھی اور مفلوک الحال رہتے ہیں۔ تم ان جیسی وضع قطع اختیار کرو۔ اور جنٹلمینی چھوڑ کر دیہات کے چکر لگاؤ۔ کارخانوں میں ڈیرے ڈالو اور ان کی حالت کی اسٹڈی کرو تم کالر ٹائی اور عمدہ سوٹ پہن کر لیڈر ضرور بن سکتے ہو مگر کسانوں اور مزدوروں کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ میں ہندوستان میں ایسی آزادی کا خواہشمند تھا جس میں غریب خوشی اور آرام سے رہے اور سب برابر ہوں۔ خدا وہ مبارک دن جلد لائے جبکہ چھتر منزل لکھنؤ میں عبداللہ مستری درکشاپ اور دھنیا چمار اور کسان بھی مسٹر خلیق الزماں، جگت نارائن اور نواب محمود آباد کے برابر کرسی پر بیٹھے نظر آئیں۔"

اس تحریر کا آخری حصہ بہت دل گداز ہے جسے پڑھ کر سر تعظیم سے جھک جاتا ہے۔

"میں خوش ہوں مسرور ہوں اور اس سپاہی کی طرح ہوں جو فائرنگ لائن پر ہنستا ہوا جا رہا ہو اور خندقوں میں بیٹھا گا رہا ہو ــــــ ہزار دکھ کیوں نہ آئیں۔ بحر ذخار درمیان میں موجیں مارے، آتشیں پہاڑ درمیان میں کیوں نہ حائل ہو جائیں۔ مگر اے آزادی کے شیرو!

اپنے گرم گرم خون کو ماتر بھومی پر چھڑکتے ہوئے اپنی جانوں کو ماتر بھومی کی دیوی پر قربان کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

میرے بھائیو! میرا اسلام لو اور اس نامکمل کام کو جو ہم سے باقی رہ گیا ہے پورا کرو۔

اٹھو اٹھو سو رہے ہو ناحق پیامِ بانگِ جرس تو سن لو
بڑھو کہ کوئی بلا رہا ہے نشانِ منزل دکھا دکھا کر

اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی

فیض آباد جیل ۔۔ ۱۶، دسمبر ۱۹۲۷ء "

اشفاق اللہ خاں کی یہ تحریر، یہ پیغام، ایک آواز ہے جو گنیش شنکر ودیارتھی سے ہوتی ہوئی کروڑوں ہندوستانیوں کے دلوں تک پہنچی اور کاکوری کیس جد وجہد آزادی کی ایک قابلِ تقلید علامت بن گیا۔ اور کاروانِ آزادی اور جوش و خروش سے اپنی منزل کی طرف بڑھا۔ اور جس صبح کو دیکھنے کی تمنا اشفاق نے کی تھی آخر کار وہ صبح جلوہ گر ہوئی۔

اشفاق اللہ خان کو خدا تعالےٰ کی ذات پر کامل بھروسہ تھا، انھوں نے پھانسی کی کوٹھری میں اپنا وقت یادِ خدا میں گزارا۔ ان کی موت کے بعد ان کی کوٹھری سے جو اہم چیزیں ملیں ان میں ان کے اشعار کی بیاض اور خود نوشت سوانح کے علاوہ ایک دعا بھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر دم تک ان کا دل اہلِ وطن کے لیے کس قدر بے قرار تھا۔

" اے مالکِ ہر دو جہاں! تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہوں کہ تو میری مدد فرما کہ میں کچھ لکھ سکوں۔ میرا علم محدود ہے مگر تیرا علم وسیع ہے کہ کل کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس طرح سورج کی روشنی

سے ذرّے چمک اٹھتے ہیں تو کبھی میرے ذرہ علم کو اپنے آفتاب علم سے روشن کر دے تاکہ میرے بعد میری یہ ناچیز تحریر جب میرے گھر کے لوگوں کو ملے اور میرے وطنی بھائی دیکھیں تو اس پر عمل کریں۔ بس اس کے سوا تیرا اشفاق کا کوری کہیں والا پھانسی والا فیدی تجھ سے تیری رضا چاہتا ہے تجھ سے تیری محبت چاہتا ہے۔ تیرا کرم چاہتا ہے ؎

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے"

جس نیک بندے کی خدا سے اتنی لو لگی ہو وہ اس کے حضور میں جانے سے گریز کیوں کرے۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب مادرِ وطن پر قربان ہو جانا اشفاق اللہ خاں کا مقدر بن چکا تھا۔ فیض آباد جیل میں ۱۹ ردسمبر ۱۹۲۷ء کی پو رنگ صبح۔ ان کے بڑے بھائی ریاست اللہ خاں کا بیان ہے کہ ۱۹ ردسمبر کی صبح کو انھوں نے پھانسی سے پیشتر غسل کیا اپنے کپڑوں کو جو انھیں استعمال کے لیے دئے گئے تھے۔ ایک یوم قبل دھو لیا تھا۔ زرد رنگا ہوا کھدر کا پاجامہ اور اسی رنگ کا کھدر کا کرتا اور ایک زرد رنگ کی چادر اوڑھی۔ قرآن شریف گلے میں ڈالا۔ چپل پہنی۔ بالوں میں کنگھی کی اور کلمہ پڑھتے ہوئے پھانسی کے تختے کی جانب روانہ ہوئے۔ جلاد ممی جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ اس کو بھی اپنے سامنے غسل کرایا تھا۔ وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اشفاق خود پھانسی کے تختے پر گئے۔ پھانسی کے پھندے کو چوما۔ نواب منور علی خاں شاہجہانپوری نے اشفاق اللہ کے قریب کھڑے ہو کر سورۂ یٰسین پڑھی۔ جب سورۂ ختم ہو گئی تو اشفاق اللہ نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا

گلے میں پھندا ڈالا گیا۔ کلمہ زبان پر تھا کہ پھانسی لگ گئی۔ ؎

"چل دئے سوئے عدم زندان فیض آباد سے"

شہید وطن اشفاق اللہ خاں کی نعش رات کے گیارہ بجے شاہجہانپور پہونچی اور دو بجے شب انھیں ان کے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کا سادہ مزار آج اہل وطن کے لیے ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ پاس ہی ان کی والدہ محترمہ ابدی نیند سو رہی ہیں ؎

شہیدوں کے مزاروں پر جڑینگے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی نام و نشاں ہوگا

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ حال سے غیر مطمئن رہتا ہے اور ماضی کی تعریف کرتا ہے، حال آں کہ یہ ضرور نہیں کہ اس کا حال لازماً بُرا ہی ہو اور ماضی خوشگوار ہی رہا ہو لیکن آپ یہاں دلیل بازی نہیں کر سکتے۔

خود نوشت سوانح عمری میں اور یادداشتیں قلمبند کرنے میں ایک اور جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ انسان وہ لمحے دوبارہ بسر کرنا چاہتا ہے، جو بیت چکے اور اب دوبارہ پلٹ کر نہیں آنے کے۔ اس طرح گویا وہ ایک مرتبہ پھر بچپن کی نادانیوں اور جوانی کی جولانیوں کا اعادہ کرنا چاہتا ہے۔ شاید غیر شعوری طور پر اس میں کچھ حسرت کی کارفرمائی بھی ہو۔

رفعت سروش نے اس مجموعے میں صرف ان لوگوں کو یاد کیا ہے جن سے ان کے قریب کے مراسم رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے حالات کی تفصیل بیان نہیں کی، کہیں کہیں اچٹتے سے اشارے ہیں۔ جن اصحاب سے متعلق انھوں نے لکھا ہے، ان میں سے بعض تاریخ ادبِ اردو کے مشاہیر میں سے ہیں۔ ان کی سوانح حیات لکھنے میں رفعت سروش صاحب کی یہ یادداشتیں مفید ثابت ہوں گی اور اس طرح تاریخ ادب کی تکمیل میں ان سے مدد ملے گی۔

مالک رام